نظریہ پاکستان کے عظیم مبلغ

قائد ملت
بہادر یار جنگ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

1) ماہ نو جون ۱۹۸۰ء (پاکستان) کے شمارے میں
بہادر یار جنگ کے رفیق کار محمد احمد خان مرحوم کا مضمون
بہادر یار جنگ کا سانحہ رحلت کے علاوہ کتاب "نظریہ پاکستان
کے عظیم مبلغ میں بہادر یار جنگ پر لکھے گئے مضامین شامل اشاعت
ہیں - جن کی تعداد ۱۷ ہے - ایک مضمون سید رحمت اللہ حسینی
کا ہے - جو نظام کالج حیدرآباد کے رسالے "نظام ادب" (تاریخ ۱۹۴۷) میں شائع
ہوا ہے -

محمد احمد خان

بہادر یار جنگ کا سانحۂ رحلت

قائد ملت، لسان الامت بہادر یار جنگ (محمد بہادر خاں) کی موت ہنوز ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔

۲۵ جون ۱۹۴۴ء کی درمیانی شب، ملت کا یہ شیر دل مجاہد، اچانک رفیق اعلیٰ سے جا ملا۔ انتقال سے ایک لمحہ پہلے تک وہ ہشاش بشاش چاق و چوبند تھے۔ انتقال کے دن انہوں نے حسب معمول تمام کام انجام دیئے۔ صبح ساڑھے گیارہ بجے مدرسۂ عربیہ نسواں کا معائنہ فرمایا اور وہاں کی طالبات کا امتحان لیا پھر انہیں مخاطب کر کے ایک نہایت موثر تقریر کی (جو ان کی آخری تقریر ثابت ہوئی) بعد عصر درس اقبال کی بیٹھک وار محفل (جو ان ہی کی کوٹھی "بیت الامت" میں منعقد ہوا کرتی تھی) میں شرکت کی اور اپنی نکتہ آفرینیوں سے اہل محفل کے قلوب کو گرمایا۔ وہیں مغرب کی نماز باجماعت ادا کی، پھر خود ہی اپنی موٹر چلاتے ہوئے جسٹس ہاشم علی خاں کے مکان، جو شہر سے دس، بارہ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، پہنچے۔ کھانے میں دیر تھی، اس لئے دوسرے مہمانوں سے مصروف گفتگو ہو گئے۔ اتنے میں حقہ ان کے آگے پیش کیا گیا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے تازہ حقے کا ایک کش لیا۔ فوراً ہی ایک جھٹکا لگا۔ دس پانچ لمحوں کے اندر ہی پیچھے کی طرف سر ڈھلک گیا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ دس پندرہ منٹ کے اندر ہی ڈاکٹروں نے آکر معائنہ کیا اور تصدیق کر دی کہ بہادر یار جنگ فوت ہو گئے۔

اس سانحۂ رحلت سے متعلق دو نقطۂ نظر قابل ذکر ہیں ایک یہ کہ وفات کا یہ حادثہ گو اچانک پیش آیا لیکن تھا قدرتی۔ بالفاظ دیگر بہادر یار جنگ کی موت طبعی تھی۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ حادثہ غیر معمولی تھا اور وفات زہر خورانی کا نتیجہ تھی میں آج بھی اتنے طویل عرصہ کے بعد جب اس واقعے پر اور اس کے سارے متعلقات اور جزئیات پر غور کرتا ہوں تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ بہادر یار جنگ کی موت زہر خورانی سے واقع ہوئی اور قطعاً طبعی نہ تھی۔ میری رائے میں اسکے وجوہ یہ ہیں

۱:- ان کی عام صحت بہت اچھی تھی اور مرنے سے ایک لمحہ پہلے تک وہ نہایت ہشاش بشاش تھے۔

۲:- انہیں کبھی دل کا عارضہ لاحق نہیں ہوا۔ اور نہ کبھی سانس رکنے کی شکایت پیدا ہوئی۔

۳:- ان کی موت اچانک، بہت ہی اچانک اور غیر معمولی مشتبہ حالات میں واقع ہوئی۔

۴:- انتقال کے بعد میں نے اور سینکڑوں آدمیوں نے بچشم خود دیکھا کہ ان کے جسم پر نیلگوں نشانات ہیں۔

۵:- ہاشم علی خاں جن کے گھر پر یہ حادثہ پیش آیا، اپنی آخری عمر میں دیوانے ہو گئے تھے اور اسی دیوانگی کے عالم میں ان کا انتقال ہوا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس حادثے کے ذمے دار تھے لیکن وہ یقیناً اس راز سے واقف تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حادثہ ان کے علم و اطلاع کے بغیر پیش آیا ہو، اور وہ اس کے بعد اس سے واقف ہو گئے ہوں اور اس کا اثر ان کے ذہن و دماغ پر پڑا ہو۔

۶:- حقہ فوراً غائب کر دیا گیا، حالانکہ بیگم بہادر یار جنگ نے ہاشم علی خاں صاحب کے گھر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا تھا کہ "حقے" کو محفوظ کر دیا جائے"۔

دعوتوں میں حقہ یا پان سگریٹ عموماً کھانے کے بعد پیش کیا جاتا ہے یہاں اس تہذیبی روش
ہٹ کر حقہ کھانے سے پہلے ہی پیش کر دیا گیا اور اگرچہ دوسرے مہمان بھی موجود تھے لیکن حقہ صرف
در یار جنگ کے روبرو پیش کیا گیا - حقے کی اس طرح پیش کشی بہت معنی خیز ہے۔ اگر کھانے
بعد حقہ پیش کیا جاتا اور پھر حادثہ پیش آتا، تو خیال کیا جاتا کہ کھانے میں کچھ ملا دیا گیا ہوگا اور جب
نہیں کئی افراد کھانے پر مدعو ہوں تو کسی ایک مخصوص شخص کے کھانے میں زہر کی ملاوٹ آسان
ہوتی "حقے" کے ذریعے زہر دینا آسان تھا۔ بہرحال حقے کی کھانے سے قبل پیش کش اور وہ بھی بلحاظ خاص
بہادر یار جنگ کے روبرو پیش کشی پھر معاً بعد اس کا غائب کر دیا جانا اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے
حقے کے ذریعے زہر دیا گیا۔

ان اسباب و علل کی بناء پر میرا آج بھی یہی خیال ہے کہ بہادر یار جنگ کی شہادت زہر خورانی کا نتیجہ تھی
حال تو جب واضح ہوتی، جب اس حادثہ کی باضابطہ طبی تحقیقات ہوتی لیکن بدقسمتی سے طبی تحقیقات
سکی - اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بیگم بہادر یار جنگ نے احترام میت کے پیش نظر پوسٹ مارٹم کی
طرح اجازت نہیں دی - میں نے خود شاہ عالم خاں صاحب سے (جو بہادر یار جنگ کے قریبی عزیز تھے) یہ کہا
کہ وہ بیگم صاحبہ کو پوسٹ مارٹم کی اجازت دینے کے لئے آمادہ کریں بیگم صاحبہ سے ملاقات کے بعد
نے جواب دیا کہ "وہ (یعنی بیگم صاحبہ) اس کے لئے قطعاً تیار نہیں ہیں، حتیٰ کہ جب ڈاکٹر محمد بہادر خاں
نواب مرحوم کے ذاتی معالج تھے - بیگم صاحبہ سے یہ کہا کہ وہ نواب مرحوم کی زبان کا ایک چھوٹا سا
کاٹ کر طبی امتحان کرنا چاہتے ہیں تو بھی بیگم صاحبہ نے اجازت نہیں دی۔ الغرض طبی تحقیقات نہ ہو سکی

اور نواب مرحوم کی وفات کے راز پر آج تک شک وشبہ کا ایک پردہ پڑا ہوا ہے کہ یہ حادثہ زہرخورانی کا نتیجہ تھا یا موت طبعی تھی، باین ہمہ ان مضبوط و مبسوط وجوہ کی بناء پر جو میں نے اوپر بیان کی ہیں میری رائے آج بھی یہی ہے کہ بہادر یار جنگ کی شہادت، زہرخورانی کا نتیجہ تھی اور طبعی موت ہرگز نہ تھی۔

اس سلسلے میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ زہر کس نے دیا اور کیوں دیا؟ واضح رہے کہ یہ دونوں سوالات ایک دوسرے سے مربوط ہیں، کیونکہ ان دونوں سوالات کے صحیح جوابات ہی پر حقیقت واقعہ تک رسائی ممکن ہے ان سوالات کے متعلق جو ...ت دیئے گئے ہیں پہلے ان پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

۱:- ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوؤں میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہوگی۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بہادر یار جنگ کی کسی ہندو سے ذاتی دشمنی نہ تھی ہاں سیاسی اختلاف ضرور تھا لیکن ہندو عوام اور ہندو لیڈر ان کا احترام کرتے تھے اور بعض ہندو تو ان سے محبت کرتے تھے، علاوہ بھی حیدرآباد کے کسی ہندو کی یہ جسارت ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ قائد ملت کو زہر دیتا۔ پھر دعوت کی اس محفل میں ہندوؤں میں سے کسی کا گزر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

۲:- نیشنلسٹ مسلمانوں پر بھی گمان کیا جاتا ہے لیکن یہ بھی محض بدگمانی ہے اور بعض بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔ حیدرآباد میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی ان کے لیڈر بیرسٹر اکبر علی خان تھے، جو قائد مرحوم کے جگری دوست تھے ان کے بہادر یار جنگ سے سیاسی اختلافات ضرور تھے لیکن یہ ان کی ذاتی دوستی میں کبھی حائل نہیں ہوئے بلکہ بعض ایسے مواقع پر انہوں نے اعلیٰ حضرت کے سامنے قائد مرحوم کی پرزور حمایت کی جب وہ ان کی مخالفت کرکے بڑے سے بڑے عہدہ یا منصب حاصل کر سکتے تھے۔ کردار کی اسی مضبوطی کی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی یا ان کے دوسرے ساتھیوں کی طرف ایسی گھناؤنی حرکت کا انتساب بھی گناہ سے کم نہیں ہے۔

۳:- ایک قیاس آرائی یہ ہے کہ لیاقت اللہ قریشی نے یہ مذموم حرکت، بیرون مملکت حیدرآباد کی ایک ممتاز شخصیت کے اشارہ کی بناء پر کی تھی۔ بہادر یار جنگ کی نامکمل سوانح عمری "حیات بہادر یار جنگ" میں اسی قیاس آرائی کا جانب اشارہ ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک گونہ اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے فاضل سوانح نگار نے ازراہ انکسار یا بنظر احتیاط اپنی ذاتی رائے کے اظہار سے گریز کیا ہے۔ لیکن اس واقعہ کی جو تفصیلات انہوں نے درج کی ہیں اور جو انداز بیان اختیار کیا ہے، اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس قیاس آرائی کو خلاف واقعہ نہیں سمجھتے ہیں۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ یہ قیاس آرائی محض ایک افسانہ ہے۔ لیاقت اللہ قریشی ریاست گوالیار کے جج تھے۔ بعض اسباب کی بناء پر وہ علیحدہ کردیئے گئے اور اسکے بعد غالباً غالباً ۱۹۴۲ء میں مستقل قیام کی غرض سے حیدرآباد دکن آگئے اور وکالت شروع کی۔

حیدر آباد آنے سے قبل انہوں نے قائدمرحوم سے رابطہ قائم کیا، جس کے جواب میں قائدمرحوم نے انہیں ہرطرح کی امداد و اعانت کا اطمینان دلایا (ملاحظہ ہو، مکتوب ۲۱۸ مکاتیب بہادر یار جنگ) ان کے حیدرآباد آجانے کے بعد بھی قائدمرحوم نے ان کی ہرطرح سے مدد کی۔ رہنے سہنے کا بندوبست کرایا۔ مقدمات دلائے، عدالت کے عہدہ داروں سے ملایا اور ہاشم علی خاں جج ہائی کورٹ کی دعوت میں، انہیں خود اپنی موٹر میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے، مصنف "حیات بہادر یار جنگ" نے لکھا ہے کہ لیاقت اللہ قریشی نے موٹر میں انہیں پان پیش کیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ نواب صاحب کو شدید بھوک لگی اور اسی پان کا یہ اثر ہوا کہ وہ جاں بحق ہوگئے سوال یہ ہے کہ لیاقت اللہ قریشی کو موٹر میں پان پیش کرتے ہوئے کس نے دیکھا؟ اتنا تو یقین سے معلوم ہے کہ موٹر میں بہادر یار جنگ اور لیاقت اللہ قریشی کے سوا اور کوئی نہیں تھا، شاید ڈرائیور نور محمد ہو اگر وہ تھا تو وہی اس واقعہ کا راوی ہوسکتا ہے، لیکن حیدرآباد میں یہ روایت کبھی نہیں سنی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں، جو حیدرآباد دکن میں چھپی تھی، اس واقعہ کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ علاوہ ازیں فاضل مصنف نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس روایت کا انکشاف ان پر پاکستان آنے کے بعد ہوا۔ یعنی راوی چشم دید گواہ نور محمد نہیں ہوسکتا پھر معلوم نہیں راوی کون ہے؟ کیونکہ مصنف نے اخفا سے کام لیا ہے اور اس روایت کو "سنجیدہ لوگوں کی قیاس آرائی" کہہ کر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔ اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں بات نہ صرف الجھ کر رہ گئی ہے بلکہ سخن گسترانہ بن گئی ہے! میری رائے میں "یہ قیاس" چاہے کتنے ہی "سنجیدہ لوگوں" کا بھی کیوں نہ ہو، قیاس مع الفارق ہے —— لیاقت اللہ قریشی، قائدمرحوم کے احسانمند تھے۔ انہیں بہادر یار جنگ سے ذاتی خصومت تھی نہ سیاسی اختلاف تھا۔ اگر بالفرض انہوں نے کسی کے اشارہ پر یہ مذموم حرکت کی تھی تو سوال یہ ہے کہ انہیں اس کے "صلہ" میں کیا ملا؟ وفات قائدملت کے بعد وہ تقسیم تک حیدرآباد میں ایک معمولی وکیل کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی چلے آئے یہاں بھی انہیں نہ تو کوئی عہدہ ملا اور نہ کوئی بلند و بالا کوٹھی ان کے ہاتھ لگی۔ وہ لشتم پشتم زندگی گزارتے رہے اور اسی عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ جب کبھی بہادر یار جنگ کے سانحۂ رحلت میں ان کے ملوث ہونے کا ذکر ان کے روبرو کیا جاتا تو وہ رونے لگتے اور قائدمرحوم کے احسانات کا تذکرہ نہایت دردمندی سے کرتے۔ اگر لیاقت اللہ قریشی نے کسی کا آلۂ کار بن کر یہ گھناؤنی حرکت کی ہوتی تو انہیں حیدرآباد میں یا پاکستان میں اس کا کچھ تو "صلہ" ملنا چاہیئے تھا! لیکن انہیں وہاں کچھ ملا نہ یہاں تو پھر یہ قیاس بے بنیاد ہی ٹھہرا کہ ان کی گلوری نے یہ کرشمہ دکھایا تھا!!

۴:- ایک نظریہ یہ ہے کہ زہر خورانی کا یہ واقعہ برطانوی حکومت کے اشارۂ چشم و ابرو کا نتیجہ تھی۔ اسمیں شک نہیں کہ برطانوی حکومت، بہادر یار جنگ سے سخت ناراض تھی اور یہ ناراضگی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب دوسری جنگ عظیم کے چھڑ جانے کے بعد بہادر یار جنگ نے مساعی جنگ میں رکاوٹ پیدا کرنے کی مہم چلائی تھی۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی حکومت سے حیدرآباد کے معاہداتی موقف کی بحالی کا وعدہ لے لیا جائے۔ بلا شبہ یہ مہم قائد مرحوم نے شروع کی تھی لیکن اسمیں بھی انہوں نے قائداعظم کے مشوروں کا اپنے آپ کو پابند رکھا تھا۔ پھر یہ مہم کانگریس کی ہندوستان چھوڑ دو والی مہم کے مثل نہ تھی اسمیں تخریب کاری کا کوئی عنصر شامل نہ تھا۔ "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے بانی گاندھی جی کو برطانوی حکومت نے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ سینے سے لگایا اور بہادر یار جنگ کو زہر دلوایا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ علاوہ ازیں خود قائداعظم نے ۱۹۴۳ء کے وسط میں بہادر یار جنگ کو ۱۰ اسرائے کے مشیر برائے سیاست ہائے ہند سر فرانسس وائیلی سے دہلی میں ملایا تھا۔ یہ بڑی اہم سیاسی ملاقات تھی اس ملاقات میں سر فرانسس وائیلی، بہادر یار جنگ کی سیاسی فراست و تدبر سے بے حد متاثر ہوا تھا اور اس کے بعد اس نے وائسرائے کو جو مشورہ دیا تھا اس ذریعہ سے بہادر یار جنگ اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں برطانوی حکومت کی پالیسی کا رخ تبدیل ہو گیا۔ ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زہر خورانی کے اس واقعے میں برطانوی حکومت کے اشارۂ چشم و ابرو کا کوئی دخل نہ تھا۔

۵:- ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس حادثہ میں حیدرآباد کے آخری حکمران میر عثمان علی خاں کا ہاتھ تھا کیونکہ بہادر یار جنگ اُن کے مخالف تھے اور نظام ان کے وجود کو اپنے تخت و تاج کے لئے خطرہ تصور کرتے تھے۔ اس گروہ نے نظام اور بہادر یار جنگ کے ظاہری تعلقات کو خصوصاً خطاب و جاگیر کی واپسی کے واقعات کو (جو بہادر یار جنگ کی زندگی کے آخری ایام میں رونما ہوئے)، ذہن میں رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے۔ نظام اور بہادر یار جنگ کے باہمی تعلقات کی مفصل تاریخ تو یہاں بخوف طوالت بیان نہیں کی جا سکتی لیکن اس کا لب لباب یہ ہے کہ ان کے درمیان سخت اختلافات بھی پیدا ہوتے رہتے اور پھر صفائی بھی ہو جاتی تھی۔ ان اختلافات کے بنیادی اسباب دو ہی ہوا کرتے تھے ایک یہ کہ نظام کے اطراف مصاحبین کا ایک ایسا گروہ تھا جو انہیں قائد مرحوم کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکاتا رہتا تھا کہ بہادر یار جنگ حقیقتاً ان کے وفادار نہیں ہیں۔ حسن اتفاق سے ایک دوسرا اتنا ہی بااثر گروہ ایسا بھی تھا جو اس قسم کی شرانگیزیوں کا فوراً ازالہ کر دیا کرتا تھا۔ ان اختلافات کا دوسرا بڑا سبب ریزیڈنسی تھی ریزیڈنٹ کی حیثیت آئین و معاہدات کی رو سے برطانوی سفیر کی سی تھی لیکن برطانوی حکومت کی ڈپلومیسی نے رفتہ رفتہ ریزیڈنٹ کو سفیر سے بڑھا کر نظام کا "سیاسی نگران کار" (POLITICAL CONTROLLEK) بنا دیا تھا۔

جون ۱۹۸۰ء

یڈنٹ کو یہ مرتبہ کیسے حاصل ہوا، یہ بجائے خود تاریخ حیدرآباد کا ایک دلدوز باب ہے اور اس کی
یں جانا موضوع زیر بحث سے خارج ہے بہرحال یہ امر واقعی تھا کہ ریزیڈنٹ نہ صرف برطانوی
ات کی نگرانی کیا کرتا تھا بلکہ مملکت حیدرآباد کے اندرونی سیاسی معاملات میں بھی ملوث تھا اور
ام پر اس کا خاصا دباؤ رہتا تھا۔ بہادر یار جنگ کی کوئی تقریر یا سیاسی سرگرمی ریزیڈنٹ کو
گزرتی تو وہ فوراً نظام پر اثر انداز ہوتا اور عثمان علی خان کا ایک عتاب نامہ بہادر یار جنگ کے نام
در ہو جاتا۔ ان دو اسباب کے سوا نظام کے عتاب کا کوئی تیسرا سبب نہ تھا نہ میرے علم میں ہے۔
ان خفگی و ناراضی کے مواقع پر بھی میں قائد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ہوں اور بعض مرتبہ ایسے موقعے
آئے کہ ان سے بالکل تنہائی میں نظام دکن کی افتاد طبیعت اور ان کی ریاست سے متعلق تفصیلی بات چیت
ہی - میں نے انہیں بعض وقت باچشم گریاں، نہایت دگیر و دل گرفتہ نظام پر سخت تنقید کرتے ہوئے بھی پایا
لیکن انہوں نے کسی مرتبہ بھی یہ نہیں کہا یا یہ تاثر نہیں دیا کہ نظام ان کی جان کے درپے ہیں یا انہیں
ی جسمانی آزار پہنچانے والے ہیں۔

آخری زمانے میں خطاب و جاگیر کی واپسی کا جو واقعہ پیش آیا اس کے متعلق بھی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی
ں۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ نظام نے ناراض ہو کر قائد مرحوم کی جاگیر اور خطاب چھین لئے تھے اور ان کی تقریر
پابندی عائد کر دی تھی - حقیقت یوں ہے کہ نظام نے جاگیر و خطاب چھینے نہیں تھے بلکہ خود قائد مرحوم نے
نہیں واپس کر دیا تھا - اس واقعہ کے اصلی و بنیادی وجوہ وہی دو تھے، جو اوپر بیان ہوئے ہیں یعنی ریزیڈنسی
دباؤ اور درباری مصاحبوں کے ایک ٹولے کی سازش - ریزیڈنسی بہادر یار جنگ کی اس لئے مخالف
ہی تھی کہ وہ مساعی جنگ میں رکاوٹیں پیدا کر کے حیدرآباد کے معاہداتی مرتبہ کو بحال کرنا چاہتے تھے، اسی لئے
یمائے ریزیڈنسی حکومت نے ان پر اندرون ریاست ایک سال کے لئے تقریر نہ کرنے کی پابندی عائد
دی تھی - اس پابندی کے ختم ہونے کے بعد جب انہوں نے ایک تقریر میں پرچم آصفی کو اسلامی علم
ر اپنے آپ کو عبد الملک نہیں عبد اللہ کہا تو سازشی مصاحبوں کے گروہ نے نظام کو بھڑکایا - ریزیڈنسی
دباؤ تو تھا ہی مصاحبوں کے اشتعال نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور نظام کا سخت عتاب بہادر یار جنگ پر
ل ہوا۔ مگر عتاب کی یہ شکل نہ تھی کہ ان کی جاگیر یا خطاب چھین لیا جائے بلکہ نظام نے اپنی ناراضی کا
ظہار بذریعہ فرمان اس طرح کیا تھا کہ مملکت حیدرآباد کے جاگیردار، منصب دار اور معاشدار، جاگیر و
اصب کے مالک ہوتے ہوئے ملک کی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے انہیں یہ اختیار ہے کہ اگر وہ سیاست
ں حصہ لینا چاہتے ہیں تو جاگیر و مناصب سے دستبردار ہو جائیں اور پھر سیاست میں حصہ لیں لیکن جاگیر و
صب کے ہوتے ہوئے وہ اسکے مجاز نہیں ہیں۔ بیان کردہ حالات و واقعات کے پس منظر میں فرمان آتے ہی

بہادر یار جنگ نے جاگیر و مناصب اور خطاب سے دستبرداری کو سیاست سے دستبرداری پر ترجیح دی اور از خود جاگیر و منصب اور خطاب واپس کر دیئے ۔ اس زمانہ میں اقبالؔ کا یہ شعر ان کے ورد زبان رہا کرتا تھا ؎

اے طائر لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی ٭ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہ حقیقتاً بہت بڑا ایثار تھا ۔ اب ان کی ماہانہ آمدنی ۹ ہزار روپیہ سے گھٹ کر ۹ سو روپیہ رہ گئی تھی جو انہیں اپنی ذاتی املاک سے حاصل ہوتی تھی ۔ ایک پشتینی نواب اور خاندانی جاگیردار کی آمدنی کا یکبیک اس تناسب سے گر جانا کوئی معمولی بات نہ تھی ۔ اخراجات میں وہ اسی تناسب سے کمی نہیں کر سکتے تھے ۔ اپنے ذاتی اخراجات میں وہ شروع ہی سے بہت محتاط تھے ۔ تاہم خاندان ، عزیز و اقارب ، نوکر چاکر ، خدام ، خدمت گار جو پہلے سے موجود تھے ۔ ان کی کفالت کی ذمہ داری سے کیونکر وہ دستبردار ہوتے تو کچھ تنگی ، نہ ہو سکتے تھے وہ انہوں نے اپنے نفس پر کی ۔ مگر ان دوسری ذمہ داریوں کو جاگیر کی واپسی کے بعد بھی انہوں نے نبھایا ۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی جاگیر و مناصب کو بچا لیتے اور سیاست سے دستبردار ہو جاتے ۔ لیکن سیاست تو ان کے لئے عبادت تھی حصول جاہ و اقتدار کا ذریعہ نہ تھی بلکہ یہ ملت کی خدمت گذاری کا ایک وسیلہ تھی جس کے ترک کر دینے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ غرض جاگیرداری سے بہادر یار جنگ از خود دستبردار ہو گئے لیکن نظام دکن سے ان کے تعلقات کا اس واقعے سے خاتمہ نہیں ہو گیا ۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ نظام قائد مرحوم کے ذاتی دشمن تھے ۔ جو شخص اس خیال کا حامی ہے وہ تو یہی کہتا ہے کہ نظام نے پہلے تو جاگیر چھین لی پھر ان کی جان لے لی مگر یہ ہوائی باتیں ہیں ۔ جاگیر کے چھین لئے جانے کی حقیقت تو آپ نے سن لی ۔ اب یہ سنیئے کہ اس کے بعد کیا ہوا ۔ پہلے مان لیا جا چکا ہے کہ قائد اعظم نے دہلی میں بہادر یار جنگ کو سر فرانسس وائیلی سے ملایا تھا اور اس کے بعد حکومت برطانیہ کی پالیسی قائد مرحوم کے متعلق بدل گئی تھی ۔ اس پالیسی کا بدلنا تھا کہ نظام کا عتاب بھی ختم ہو گیا اور وہ رنجش بھی دور ہو گیا جسکو درباری مصاحبوں کی سازش سے وقتاً فوقتاً ہوا ملتی رہتی تھی بلکہ بہادر یار جنگ کی زندگی کے آخری دور میں تو خطاب کے بجائے نظام دکن نے واپسی خطاب و جاگیر تک کا فیصلہ کر لیا تھا ۔ جس کا ذکر بہادر یار جنگ کے مکتوب بنام قائد اعظم میں بھی ملتا ہے ۔ (دیکھیئے مکاتیب بہادر یار جنگ ص ۲۹ مکتوب نمبر ۲۶) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انتقال سے صرف چند ماہ قبل انہیں وزارت کی پیشکش کی گئی تھی جسکو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ پھر انہیں نائب وزارت عظمیٰ پیش کی گئی جسکو انہوں نے اس شرط کے ساتھ قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ وہ مجلس اتحاد المسلمین (مملکت حیدرآباد کی سیاسی جماعت جس کے وہ صدر تھے) کی مجلس شوریٰ (کونسل) کے باضابطہ رکن رہیں گے یہ باتیں

...جھ سے خود قائد مرحوم نے بیان کی ہیں نائب وزارت عظمیٰ کے ساتھ شجیع الملک کا خطاب عطا ہونے والا تھا جس کے بارے میں فرمان تک لکھا جا چکا تھا، اگرچہ اس کے شائع ہونے کی نوبت، ان کے اچانک انتقال کے باعث نہ آسکی۔

جاگیر و خطاب کی واپسی کے اس واقعہ کو ذرا پھیلا کر میں نے اس لئے لکھا ہے کہ آخری زمانۂ حیات میں بہادر یار جنگ اور نظام کے باہمی تعلقات کی ایک واضح تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے اور وہ غلط فہمیاں دور ہوجائیں، جو اس سلسلہ میں عام طور پر پھیلی ہوئی ہیں، میں یہاں نظام کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ نظام میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں، لیکن ان کی سیاست کے بیشتر پہلوؤں سے بیشتر مسلم زعماء کو اختلاف تھا ان سے بعض عظیم حماقتیں بھی سرزد ہوئیں لیکن مندرجہ بالا واقعات، اس بات پر شاہد ہیں کہ قائد مرحوم کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے اور نظام کے مابین تعلقات خوشگوار اور معتدلانہ تھے۔

ان واقعات کی روشنی میں یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ زہر خورانی کے اس اندوہناک واقعہ میں نظام کا ہاتھ ہو،

یہاں تک تو یہ بتایا گیا کہ ہندوؤں، نیشنلسٹ مسلمانوں، لیاقت اللہ قریشی، برطانوی ریزیڈنسی اور نظام دکن ان میں سے کسی نے بھی بہادر یار جنگ کو زہر دیا نہ دلوایا کیوں کہ عقل و قیاس ہی نہیں تاریخی واقعات و حقائق اس قیاس کی تردید کرتے ہیں کہ بہادر یار جنگ کی زہر خورانی کے سلسلہ میں جن اشخاص پر بالعموم شبہ کیا جاتا ہے انہیں سے کوئی ایسی ملوث رہا ہو تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کس کا ہاتھ تھا اور کون سا خفیہ ہاتھ تھا جو اس قدر چابکدستی سے اتنا بڑا کام کر گیا۔

حقیقت حال کا علم تو صرف اللہ ہی کو ہے۔ لیکن آثار و قرائن سے جو نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں انہیں میں یہاں درج کرتا ہوں۔ واضح رہے کہ یہ میری اپنی ذاتی رائے ہے۔

بہادر یار جنگ کی زندگی میں، ان سے قریب رہنے اور ان کی وفات کے بعد مجلس اتحاد المسلمین کی سیاسی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے کے باعث مجھے حیدرآباد کے سیاسی معاملات کا گہری نظر سے مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے مواقع حاصل رہے ہیں۔ میں اپنے اس مطالعے و مشاہدے کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ بہادر یار جنگ کی زہر خورانی کے المناک واقعے میں مسلمانوں ہی کے ایک ایسے جتھے (CLIQUE) کا ہاتھ تھا، جو ایک طرف تو حکومت حیدرآباد کے کلیدی مناصب پر قابض تھا اور دوسری طرف نظام کے دربار میں خاصہ اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ مقصد اس جتھے کا یہ تھا کہ حیدرآباد کی سیاست کو ایسی ڈگر پر چلایا جائے، جس ...یات کے دروبست پر قابض رہے تاکہ اس کے مفادات حاصلہ (VESTED INTERESTS) ...زد نہ پڑے۔ بہادر یار جنگ کی سیاست سے اس جتھے کے اختلافات کے بنیادی اسباب دو تھے۔

جو ۱۹۳۸ء سے چلے آرہے تھے۔

۱:۔ بہادر یار جنگ مملکت حیدرآباد کے دستوری ڈھانچے میں مسلمانوں کی برتری کے علمبردار تھے جس کی خاطر انہوں نے ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں یعنی سر اکبر حیدری کی وزارت عظمیٰ کے دور میں ایک کامیاب جنگ لڑی تھی اور قائداعظم محمد علی جناح کے توسط سے اپنے نقطۂ نظر کو مملکت حیدرآباد اور نظام سے منوالیا تھا اور اسی وقت سے انہوں نے حیدرآباد میں اپنی سیاست کو قائداعظم کے مشورہ و ہدایت کا پابند کر رکھا تھا اس جتھے کو یہ بات گوارا نہیں تھی اور یہ جتھا حیدرآباد کی سیاست کو مسلم لیگ سے توڑ کر کانگریس سے جوڑنا چاہتا تھا تاکہ مستقبل کے سیاسی پیچ کھیڑ میں جس کی پرچھائیاں دوسری عالمی جنگ کے دوران ہی نظر آنے لگی تھیں وہ فرد کو مضبوط بنا سکے اور مملکت حیدرآباد کے کلیدی مناصب بدستور ان کے اور ان کی آنے والی نسلوں کے قبضہ میں رہیں۔

۲:۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ بہادر یار جنگ ریاست کے نظم و نسق کو جانبداری، اقربا پروری، دھڑے بندی اور رشوت ستانی سے پاک دیکھنا چاہتے تھے اور یہی اس جتھے کی پشتینی کمزوریاں تھیں - قائد مرحوم اپنی پبلک تقریروں اور نجی محفلوں میں ان کمزوریوں پر سخت گرفت کیا کرتے تھے اور جب کبھی موقع ملتا تو عملی اقدام سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

یہ جماعت کوئی عوامی سیاسی جماعت نہ تھی، نہ یہ کوئی انجمن یا مجلس تھی یہ ایک سازشی ٹولہ تھا۔ اس لئے بہادر یار جنگ کے خلاف کھلم کھلا کوئی تحریک ہندوؤں یا مسلمانوں میں نہیں چل سکتا تھا دوسرے اس ٹولے کے افراد باہمدگر عزیز و رشتہ دار تھے اور ان میں عقائد اور مفادات کا اشتراک بھی تھا - ان میں سے بیشتر افراد ذہین و فطین بھی تھے اور اس ٹولہ کا ایک فرد جو دراصل اس جتھے کا "دماغ" تھا اس کو بہادر یار جنگ "الذهبي الخبيث" (EVIL GENIUS) کہا کرتے تھے اور حیدرآباد کا ایک "امیر کبیر" جو خود کبھی سیاست کے سیہ سفید کا مالک رہ چکا تھا اور جس کے خاندان میں وزارت عظمیٰ کا منصب جلیا گردش کرتا رہتا تھی۔ اس ٹولہ کا سرپرست اعلیٰ تھا وہ حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ کو اپنا خاندانی استحقاق سمجھتا تھا اس ٹولہ کے کچھ افراد تو حکومت کے کلیدی عہدوں پر قابض تھے اور کچھ نظام کے دربار میں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کا طریقۂ کار (MODUS OPERANDI) یہ تھا کہ پہلے نظام کو بہادر یار جنگ کے خلاف بھڑکایا جائے، پھر حکومت کی مشینری کو حرکت دی جائے۔ جن آثار و قرائن کی بناء پر میں اس ٹولہ کو مورد الزام گردانتا ہوں وہ درج ذیل ہیں۔

(الف) یہ ٹولہ بہادر یار جنگ کا ان کی ابتدائی سیاسی زندگی (۱۹۳۶ء) سے آخر وقت تک مخالف رہا۔ ۱۹۳۸ء میں جب بہادر یار جنگ نے مسلمانانِ حیدرآباد کی سیاسی برتری کا اعادہ

کیا تو اس ٹولے نے ان کی مخالفت کی "ہم بادشاہ ہیں، جمیع مسلمانان دکن بادشاہ ہیں۔ اعلیٰ حضرت (حضور نظام) کا تخت و تاج مسلمانان دکن کے سیاسی و تمدنی اقتدار کا مظہر ہے"۔ یہ وہ نعرے تھے جن کے ذریعے بہادر یار جنگ نے مسلمانان دکن کی سیاسی برتری کا اظہار کیا تھا اور ان فقروں کو عوامی رنگ دینے کے لئے ان کو مسلمانوں کا سیاسی کلمہ قرار دیا تھا۔ اس ٹولے نے ان فقرات کو غلط معنی پہنائے اور نظام کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ بہادر یار جنگ مسلمانان دکن کی بادشاہت کا ادعا کرنے کے بعد مسلمانان دکن کے نمائندے کی حیثیت سے خود دکن کے بے تاج بادشاہ ہو جانے کا خواب دیکھ رہے ہیں "نحن الملک" کا یہ نعرہ "أنا الملک" کی تمہید ہے اور سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر آباد کو یہ باور کرایا کہ بہادر یار جنگ حکومت کے متعلقہ اصلاحات دستوری کے نہ صرف پرخچے اڑا دینا چاہتے ہیں بلکہ ان کی وزارت عظمیٰ کا تختہ بھی الٹ دینا چاہتے ہیں۔ اس طرح نظام اور حکومت دونوں کو بہادر یار جنگ کی گرفتاری پر اکسایا گیا لیکن ستمبر ۱۹۳۹ء میں سر اکبر حیدری کی دعوت پر قائد اعظم کی حیدر آباد میں تشریف آوری سے ان کی یہ چال الٹ گئی اور بہادر یار جنگ کو کامیابی ہوئی اور اس ٹولے کو شکست۔ بہادر یار جنگ نے دوسری عالمی جنگ کے دوران جب حیدر آباد کے معاہداتی موقف کی بحالی کی تحریک شروع کی تو برطانوی حکومت ناراض ہو گئی، بہادر یار جنگ نے اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے حکومت حیدر آباد پر دباؤ ڈالا اور جب حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی تو انہوں نے تبدیلی وزراء کا مطالبہ کیا۔ اس ٹولے نے پھر دوسری مرتبہ موقع سے فائدہ اٹھایا اور نظام کو یہ باور کرایا کہ بہادر یار جنگ نظام کو انگریزوں سے ٹکرانا چاہتے ہیں اور وزیر اعظم وقت کو یہ باور کرایا کہ ان کے عہدہ کی اب خیر نہیں ہے اس مرتبہ حکومت اور نظام دونوں برافروختہ ہو گئے لیکن جب بہادر یار جنگ نے بالمشافہ نظام کے روبرو اپنے مسلک اور طرز عمل کی وضاحت کی تو پھر اس ٹولے کو شکست ہوئی اس کے بعد پھر ایک مرتبہ اس جتھے کو سازش کرنے کا موقع اس وقت ملا جب والی حیدر آباد کو برطانوی حکومت نے ایک معمولی سا خطاب عطا کیا قائد ملت بہادر یار جنگ نے اس خطاب کو خانوادۂ آصفی کی توہین قرار دیا جس پر ریزیڈنٹ چراغ پا ہو گیا۔ اس موقع سے اس ٹولے نے پھر فائدہ اٹھایا اور بہادر یار جنگ کی زبان بندی کرادی۔ یہ بعض اہم سازشی واقعات تھے، جنہیں مثالاً یہاں پیش کیا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے علاوہ متعدد ایسے واقعات ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ سازشی ٹولہ شروع ہی سے بہادر یار جنگ کے خلاف اور ان کے درپئے آزار تھا۔

۲:- بہادر یار جنگ کی زندگی کا آخری زمانہ ان کی سیاسی زندگی کا نقطۂ عروج تھا۔ ان کے

کے مشیر ریاست ہائے ہند سر والٹر منکٹن سے ملاقات کے بعد برطانوی حکومت بہادر یار جنگ کے تدبر و فراست کا لوہا مان چکی تھی اور انہیں حیدرآباد ہی نہیں دیگر ریاست ہائے ہند کے معاملات میں ایک اہم فیصلہ کن سیاسی قوت تسلیم کر چکی تھی۔ یہ اس ٹولہ کی بڑی شکست تھی۔ پھر نظام دکن نہ صرف ان کے خطاب اور جاگیر کی واپسی کا فیصلہ کر چکے تھے بلکہ بہادر یار جنگ کے شرائط پر انہیں نائب وزارت عظمیٰ کی موقر خدمت پر اور شجیع الملک کے خطاب سے سرفراز کرنا چاہتے تھے۔ نائب وزارت عظمیٰ دراصل وزارت عظمیٰ ہی تھی اور عملاً انہیں اختیارات وزارت عظمیٰ ہی کے دیئے جا رہے تھے محض ہندوؤں کے اعتراض کے پیش نظر نام نائب وزارت عظمیٰ رکھا گیا تھا۔ بہادر یار جنگ کو یہ مراتب حاصل ہونے کے بعد اندرون حیدرآباد ان کی سیاسی قوت مستحکم ہو جاتی اور یہی چیز اس ٹولے کے لئے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اگر بہادر یار جنگ اس طرح برسر اقتدار آجاتے تو اس ٹولے کے ایک ایک فرد کا محاسبہ ہوتا اور اپنے عہدوں اور مناصب کو بچانا تو کجا وہ کسی صورت سے بہادر یار جنگ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا تھا بیرون حیدرآباد بھی بہادر یار جنگ کی سیاسی پوزیشن نہایت مضبوط و مستحکم ہو گئی تھی۔ وہ آل انڈیا لیڈر، مسلم لیگ کے صف اوّل کے قائد اور قائد اعظم کے مخلص ترین و معتمد علیہ رفیق سمجھے جاتے تھے۔ ان کی یہ پوزیشن اس ٹولے کی نظروں میں بُری طرح کھٹکتی تھی اور مستقبل کے سیاسی نقشہ میں اسے اپنا کوئی مقام نظر نہیں آتا تھا۔ بہادر یار جنگ نے حیدرآباد کی سیاست کو قائد اعظم اور مسلم لیگ کی سیاست سے اس طرح مربوط کر رکھا تھا کہ ان کے رہتے ہوئے کوئی قوت اس رابطے کو توڑ نہیں سکتی تھی۔ خود نظام دکن حیدرآباد کے سیاسی معاملات میں اور وزراء کے تقرر میں رد و بدل میں قائد اعظم سے مشورہ کرنے اور ان کی ہدایتوں پر عمل کرنے لگے تھے۔ قائد اعظم سے نظام دکن کے اور حیدرآباد کے یہ سارے سیاسی بندھن بہادر یار جنگ ہی نے استوار کئے تھے اگر یہ برقرار رہ جاتے تو حیدرآباد کے مستقبل کی صورت گری قائد اعظم کے ذہنی نقشہ کے مطابق ہوتی، جس میں اس ٹولے کا یقیناً کوئی مقام نہ ہوتا۔ اس کے برعکس یہ ٹولہ ریاست کی سیاست کو اپنے مفادات حاصلہ کے تحفظ کے خاطر ایسی ڈگر پر چلانا چاہتا تھا جس سے کانگریس سے رشتہ جڑتا اور قائد سے رشتہ ٹوٹ جاتا تھا لہٰذا اندرون حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد بہادر یار جنگ کی پوزیشن کا یہ استحکام اور ان کا یہ سیاسی عروج اس ٹولے کے گلے کا پھندا بن گیا تھا اور بہادر یار جنگ کا وجود اس گروہ کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا تھا اور ان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ حالات ایک ایسے فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو گئے ہیں کہ بہادر یار جنگ کو مزید موقع ملا تو یہ جتھا ہمیشہ کے لئے قعر مذلت میں گر جائے گا اس لئے بہادر یار جنگ کو ہٹا کر موجودہ اور آئندہ کے تمام مواقع اپنے لئے محفوظ کر لینا چاہئے۔ میری دانست میں بہادر یار جنگ

کا یہ سیاسی عروج اس ٹولے کی گھناؤنی سازش کے باعث بنا اور اس نے اسی نوبت پر یہ فیصلہ کیا کہ بہادر یار جنگ کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی انہیں ملک کے سیاسی نقشہ ہی سے نہیں، صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے اور اس کے لئے اس نے پوری ذہانت اور عیاری سے کام لے کر بہادر یار جنگ کے ایک دوست کے گھر دعوت کے موقع کا انتخاب اور حقہ کے کش کا انتظام کیا تاکہ اصل مجرمین کے چہروں پر آخر وقت تک پردہ پڑا رہے اور کسی کا گمان بھی ان کی طرف جانے نہ پائے اور یہی مصلحت تھی حقے کو غائب کر دینے کی!

۳:- تیسرا اور سب سے محکم قرینہ، اس ٹولے کو مورد الزام قرار دینے کا یہ ہے کہ بہادر یار جنگ کی موت پر حیدر آباد اور بیرون حیدر آباد کوئی آنکھ ایسی نہ تھی، جو روئی نہ ہو - لیکن اس ٹولے کے سرگروہ نے اپنے محل میں ______ بہادر یار جنگ کی خبر رحلت سنکر مٹھائی تقسیم کی — اس واقعہ کا چشم دید گواہ اس امیر کبیر کا خادم خاص آج بھی حیات ہے اور کراچی (لانڈھی) میں سکونت پذیر ہے۔

۴:- بہادر یار جنگ کی وفات کے بعد، حیدر آباد میں جو سیاسی واقعات پیش آئے وہ بھی اسی بات کی گواہی دیتے ہیں کہ دہر خرابی کا یہ حادثہ اسی ٹولے کے کرتوتوں کا نتیجہ تھا۔ بہادر یار جنگ کی وفات کے بعد سے سقوط حیدر آباد تک ریاست میں جو بعض اہم واقعات رونما ہوئے انہیں مختصراً درج کیا جاتا ہے۔

پہلا اور اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ ابوالحسن سید علی صاحب نے جو بہادر یار جنگ کے بعد ان کے سیاسی جانشین اور مجلس اتحاد المسلمین کے صدر منتخب ہوئے تھے انہوں نے اپنی عاملہ اور مجلس شوریٰ کے علم و اطلاع کے بغیر ریاستی کانگریس کے ہندو لیڈر راما چاری سے سر سالار جنگ کی سرپرستی میں ان ہی کے محل میں خفیہ معاہدہ کر لیا - یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک بہادر یار جنگ کی زندگی میں بھی چلی تھی اور خود انہوں نے ہندو لیڈروں سے متعدد بار مذاکرات کئے تھے لیکن ان مذاکرات میں کسی امیر کبیر نے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی - مگر بہادر یار جنگ کے انتقال کے بعد ابوالحسن سید علی اور راما چاری کے مذاکرات سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں ہوئے اور ان کی موجودگی میں خفیہ معاہدہ طے پایا - کیا یہ سب امور معنی خیز نہیں ہیں۔

اس خفیہ معاہدہ کی وجہ سے ابوالحسن سید علی کے خلاف مسلمانوں کے اندر شدید رد عمل ہوا اور انہیں صدارت مجلس اتحاد المسلمین سے مستعفیٰ ہونا پڑا - اب اس ٹولے نے دوسری چال چلی یعنی مجلس اتحاد المسلمین کو حکومت سے ٹکرا دیا - ڈچپلی (ضلع نظام آباد) میں ایک مسجد، جو دو امیوں

کے مشن ہسپتال کے احاطہ میں واقع تھی مشن ہسپتال کے پادری کے ایماء واشارہ سے ڈھادی گئی مجلس اتحاد المسلمین نے اس کے خلاف ایک احتجاجی مہم چلائی - جلسہ ہوا اور جلوس صدر اعظم وقت نواب سر احمد سعید خان چھتاری کی کوٹھی پر گیا - اس لوٹلے نے اس احتجاج سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اپنی منصوبہ بندی کے مطابق اس جلوس میں شامل اپنے افراد کے ذریعہ صدر اعظم پر حملہ کرایا ان کی سرکاری کوٹھی شاہ منزل میں توڑ پھوڑ کی اور آگ لگادی - شاہ منزل کے اس حادثہ سے یہ جیتھا دو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا ایک یہ کہ حکومت سے لڑا کر مجلس کو کمزور کردیا جائے دوسرے یہ کہ نواب چھتاری کی جگہ اپنی پسند کے وزیر اعظم کو لایا جائے - اسکو اپنے ان دونوں مقاصد میں کامیابی ہوئی - اصل تو طور پر مجلس کمزور پڑگئی اور نواب صاحب چھتاری نے استعفیٰ دے دیا -

ان کی جگہ نئے وزیر اعظم کے تقرر کا سوال بہت اہم تھا، دوسری جنگ عظیم اب تقریباً ختم ہوچکی تھی - برطانوی حکومت ہندوستان سے اپنا بوریا بستر لپیٹنے کی فکر کررہی تھی - ایسے نازک موقعے پر حکومت حیدرآباد کی سربراہی ایک ایسی شخصیت کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے تھی جو مستقبل میں مسلمانانِ حیدرآباد کے مفادات کا تحفظ اور خود ریاست حیدرآباد کے معاہداتی موقف کی بحالی کا فراست و ذہانت کے ساتھ بندوبست کرسکے - یہ اسی وقت ممکن تھا جب حیدرآباد کی سیاست کو مسلمانان ھند کی حمایت اور قائداعظم کی ہدایت و رہنمائی حاصل ہوتی - اسی لئے خود قائداعظم کی نظروں میں اس موقع پر حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ بڑی اہمیت رکھتی تھی اب بہادر یار جنگ تو رہے نہیں تھے، جو نظام اور قائداعظم کے درمیان رابطہ کا کام انجام دیتے اور نظام کو قائداعظم کی ہدایت کے مطابق راہ عمل اختیار کرنے پر آمادہ کرتے - اس لوٹلے نے حالات کی اس نزاکت سے فائدہ اٹھایا اور سازشوں کا ایک جال پھیلادیا نظام ان سازشوں کا شکار بن گئے تو اس لوٹلے نے وزارت عظمیٰ کے لیے ان کے سامنے سر مرزا اسمٰعیل سابق دیوان ریاست میسور و جے پور کا نام پیش کیا جن کے کانگریس اور ہندو زعماء سے گہرے روابط تھے - شملہ کانفرنس میں لارڈ ویول وائسرائے ھند کی زبانی جب قائداعظم نے یہ سنا کہ نظام سر مرزا کو حیدرآباد کا وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں اور تقرر کے مراحل تقریباً سب طے پا چکے ہیں تو وہ اپنی اولین فرصت میں بنفس نفیس حیدرآباد تشریف لائے، لیکن افسوس صد ہزار افسوس کہ اسی لوٹلے نے اپنی سازشوں کے جال میں نظام کو اس طرح پھانس رکھا تھا کہ قائداعظم اور نظام کی ملاقات میں اصل مسئلہ پر سرے سے بات چیت کی نوبت ہی نہ آنے دی اور دو منٹ کے اندر ایسی تلخی پیدا ہوئی کہ نظام کی کوٹھی سے قائداعظم نہایت برافروختہ واپس چلے گئے - یہ سب کچھ اسی لوٹلے کی کامیاب سازش کا نتیجہ تھا پھر اسی لوٹلے نے بڑی چالاکی سے سر مرزا اسمٰعیل کے ہم وطن اور ان ہی کی لابی کے دو افراد کو

مجلس کے حلقوں میں گھسا دیا اور ان دونوں نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ نہ صرف مجلس کو سر مرزا کے تقرر کے خلاف احتجاج سے باز رکھا بلکہ بعض نمایاں لیڈروں کو اس تقرر کی حمایت کے لئے آمادہ کر لیا۔ یوں قائداعظم کا مشن ناکام ہوا اور سر مرزا اسمٰعیل حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہو گئے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سر مرزا کے وزارتِ عظمیٰ پر تقرر کے ساتھ ہی حیدرآباد کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ انہوں نے حیدرآباد کی مسلم مملکت کو ہندو کانگریس کی گود میں اور مہاتما جی کے چرنوں میں ڈالنے کا پورا پورا اہتمام کیا اور اس غرض کی تکمیل کے لئے تین اہم کام انجام دیئے۔

۱:- ایک تو یہ کہ مجلس اتحاد المسلمین کو سیاسی حیثیت سے کمزور کیا یہاں تک کہ انہوں نے مجلس کے پہلے وفد کو جو ان سے ملنے گئے تھا سیاست سے کنارہ کش ہو کر تبلیغی کام کرنے کا مشورہ دیا۔

۲:- دوسرے یہ کہ مسلم حیدرآباد کی سیاست کو قائداعظم اور مسلم لیگ سے نہ صرف بالکلیہ بے تعلق کر دیا بلکہ قائداعظم کے بتائے ہوئے راستہ سے ہٹا کر کانگریسی ڈگر پر ڈال دیا۔ انہوں نے حیدرآباد کے معاہداتی موقف کی بحالی اور برطانیہ سے نئے تعلقات کی استواری کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے حکومت کی پوری مشینری کو شہر کی نام نہاد آرائش کی خاطر صرف مختلف عمارتوں کی توڑ پھوڑ پر لگائے رکھا یہاں تک کہ وہ خود ملک بھر میں "مرزا توڑ پھوڑ" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک چال تھی "نظام اور مسلم عوام کی توجہ کو حیدرآباد کے اصل مسئلہ کی طرف سے ہٹانے کی!!

۳:- تیسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ "برن گن فیکٹری" کو خریدنے اور حکومت کی تحویل میں لے کر اسکو چلانے کی نہایت اہم اور مفید تجویز کو رد کر دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اسلحہ سازی کا یہ کارخانہ، جنوبی ایشیاء کے عظیم ترین کارخانوں میں سے ایک تھا، جو اتحادیوں (برطانیہ، امریکہ، اور روس) نے حیدرآباد میں قائم کیا تھا۔ ختم جنگ پر اس کارخانہ کی انتظامیہ نے اس کو برائے نام قیمت پر حکومت نظام کے ہاتھوں فروخت کی پیشکش کی تھی۔ لیکن سر مرزا اسمٰعیل جو اس وقت صدر اعظم حیدرآباد تھے انہوں نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ نظام حیدرآباد کو کسی سے لڑنا نہیں ہے! یہ ایک بہت ہی کھلی ہوئی بددیانتی تھی جو سر مرزا اسمٰعیل نے مسلم حیدرآباد کے ساتھ کی تھی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جب بھارت آزاد ہو گیا اور اس نے حیدرآباد پر فوج کشی کی تو حیدرآباد تقریباً نہتا تھا۔ اگر سر مرزا نے برن گن فیکٹری

خرید لی ہوتی تو شاید پنڈت نہرو کو حیدر آباد پر حملہ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑتا۔
سر مرزا اسمٰعیل کی ان حرکتوں کو دیکھنے کے بعد نظام کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے ان کو صدارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا - چڑیاں تو کھیت چگ چکی تھیں جس پٹڑی پر حیدر آبادی سیاست کی گاڑی کو نواب بہادر یار جنگ، قائد اعظم کی ہدایت و رہنمائی میں چلا رہے تھے - سر مرزا اسمٰعیل نے اس کو بالکلیہ ایک دوسری بلکہ مخالف پٹڑی پر بہت آگے ڈھکیل دیا تھا۔
دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد سے برطانوی ہند کے سیاسی حالات بھی جلد جلد تغیّر پذیر تھے اور حیدر آباد کی سیاسی گاڑی بہادر یار جنگ اور قائد اعظم کی رہنمائی سے محروم ایک ایسے راستہ پر شتر بے مہار کے مانند رواں تھی، جس کا کوئی رخ تھا نہ منزل اور جس کا ایک عمیق غار میں گر جانا مقدر ہو چکا تھا - سر مرزا اسمٰعیل کے بعد سقوط حیدر آباد تک جو کچھ ہوا وہ حیدر آباد کا المیہ نہیں بلکہ اس المیہ کا آخری سین (EPILOGNE) تھا - المیہ کا آغاز تو دراصل بہادر یار جنگ کی شہادت سے ہوا اور صدارت عظمیٰ کے سنگھاسن پر سر مرزا کے براجمان ہونے کے بعد ہی یہ ڈرامہ اپنے نقطۂ عروج (CLEMAX) پر پہنچا - اس نقطۂ عروج کے بعد رونما ہونے والے واقعات میرے موضوع سے خارج ہیں نیز ان کی حیثیت میری نگاہ میں ایک تیز و تند طوفان میں چند ابھرتے ہوئے بلبلوں سے زیادہ نہیں ہیں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ حیدر آباد کے المیئے میں سر مرزا اسمٰعیل کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اس کردار کو کھل کر اپنا کھیل کھیلنے کا موقع اسی سازشی ٹولے نے اپنی منصوبہ بندی کے ذریعے فراہم کیا اور اسی نے ان کو حیدر آباد میں لانے اور وہاں کی سیاست کو قائد اعظم سے توڑ کر کانگریس سے ملحق کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا - اگر بہادر یار جنگ زندہ ہوتے تو کانگریس کا حاشیہ بردار یہ سازشی ٹولہ اپنا یہ گھناؤنا کھیل کھیلنے نہ پاتا - اسی لئے اس ٹولے نے اپنے راستہ کی اس سب سے بڑی رکاوٹ کو زہر دیکر دور کر دیا۔

آخر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کا "انعام" اس ٹولے کو کیا ملا ؟ وہی جو وہ چاہتا تھا وہی بہادر یار جنگ کی وفات کے بعد سے سقوط حیدر آباد تک یہ ٹولہ بدستور مملکت آصفیہ کے دروبست پر چھایا رہا کلیدی عہدے اور مناصب اسی کے قبضہ میں رہے - دربار میں بھی سرخرو رہا اور سرکار میں بھی - پھر سقوط حیدر آباد کے بعد بھی اس ٹولے کی چاندی ہی چاندی تھی - اس ٹولے کے افراد، بھارت میں گورنر، سفیر اور وزیر بنے - سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس ٹولے کے کسی رکن کا کوئی سیاسی کیریئر نہیں تھا - ان میں سے کوئی بھی کانگریس کا لیڈر تو کجا معمولی کارکن یا دو آنہ کا رکن بھی نہ تھا - علمی قابلیت کے لحاظ سے سوائے ایک کے کسی کے پاس نہ کوئی اعلیٰ ڈگری تھی نہ کوئی اعلیٰ معیار کا تجربہ لیکن ان ہی میں سے ایک صاحب کے فرزند

جو لشتم پشتم میٹرک پاس کر سکے تھے اور انگلستان میں تین سال تک قیام رکھنے کے بعد باوجود وہاں سے کوئی معمولی ڈپلوما یا سرٹیفکیٹ بھی حاصل نہ کر پائے تھے وہ بھارتی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے پارلیمانی سکریٹری بنے اور پھر اس سے بھی بلند تر عہدے پر سرفراز کیے گئے!! آخر یہ کن "خدمات جلیلہ" کا انعام تھا؟ یہ انعام تھا حیدر آباد کی سیاست کو قائد اعظم اور مسلم لیگ سے بے تعلق کرکے کانگریس سے نتھی کرنے اور اس طرح حیدر آباد کو پکے ہوئے پھل کی طرح بھارت کی گود میں ڈالنے کا! اور یہ گروہ اس "خدمت جلیلہ" کو انجام دینے کے قابل اسی وقت ہو سکا، جب کہ اس نے بہادر یار جنگ کا گلا زہریلے تمباکو کے دھوئیں سے گھونٹ دیا! اسی لئے میں کہتا ہوں کہ حیدر آباد ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو نہیں۔ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو ختم ہو گیا جب بہادر یار جنگ نے آخری ہچکی لی۔

فاعتبروا یا اولوالابصار

STERLING

تذکرہ بہ پاکستان آئے مجھے ملا
نواب بہادر یار جنگ
از پروفیسر محمد خلیل اللہ
سپیشل ... گورنمنٹ
... ...
شعبہ تصنیف و تالیف
مرتبہ محمد ...

"نواب بہادر یار جنگ جے پور میں"

ورودِ اوّل

یہ غالباً ۱۹۴۰ء کے اواخر یا ۱۹۴۱ء کے اوائل کا ذکر ہے کہ میرے چھوٹے بھائی (امام وائی خان) نے جو ریاست جے پور میں واقع چھوٹی لائن (بی بی سی آئی آر) کے باندی کوئی ریلوے جنکشن پر متعین تھا، بہ سبیل استعجال مجھے مطلع کیا کہ گذشتہ شب نواب بہادر یار جنگ نے یہاں ایک بڑی پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی ہے اور اب جے پور ہی کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔

خداوند کریم منشی امیر الدین خاں مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جو جے پور کے مسلمانوں کی سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی حلقوں کے روح رواں اور انتہائی پُرجوش و مخلص کارکن تھے۔ جے پور کے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ دینے کے لیے تو انھوں نے جو کام کیا اس کی بنا پر اگر انھیں جے پور کا سر سید کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ان کی خدمات کا کچھ نقشہ عزیز گرامی خسرو مسلمہ نے بزرگ کل کے قائد اعظم نمبر میں کھینچا ہے جس سے قارئین ان کی لگن اور بے لوثی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں انھوں نے مولانا محمد علی جوہر علیہ الرحمۃ کے ساتھ بھی مدت تک کام کیا تھا جس کے نتیجے میں قومی و ملی احساسات میں بڑی شدت تھی وہ نہایت دور رس نظر رکھتے تھے۔ مسلمانان جے پور کو بہمہ جہات مسلمانان ہند کے دوش بدوش لانے کے لیے تمام ممکنہ مساعی میں تن من دھن سے کوشاں رہتے تھے۔ ایسے شخص کی عقابی نظر سے نواب بہادر یار جنگ کی تشریف آوری کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے چند معزز ترین مسلمانان جے پور کی ایک استقبالیہ کمیٹی تشکیل کی جس کے صدر نواب ممتاز الدولہ سر محمد فیاض علی خاں بہادر مرحوم رئیس اعظم ریاست پہاسو ضلع بلند شہر اور وزیر اعظم ریاست جے پور و جاگیردار ٹھکانہ لے پور، ریاست جے پور) کے نبیرۂ خورد حاجی کنور محمد منظم علی خاں صاحب (مرحوم) تھے۔ انھیں کے خلف اکبر اور نواب ممتاز الدولہ مرحوم کے قانونی وارث عزیز گرامی کنور محمد اعظم علی خاں خسرو ہی ہیں۔ دراصل منشی امیر الدین خاں صاحب مرحوم کی دعوت پر نواب بہادر یار جنگ علیہ الرحمۃ جے پور تشریف لائے تھے۔ چنانچہ منشی امیر الدین خاں صاحب نے ایک شاندار جلوس کا اہتمام کیا اور استقبال کے لیے رضاکاروں کی ایک جماعت تیار کی گئی جن میں میں بھی نہ صرف شامل تھا بلکہ وہ تمام رضاکار میرے تحت تھے۔

جب نواب صاحب کی ریل جے پور اسٹیشن پر پہنچی تو ہم رضاکاروں نیز دیگر سیکڑوں افراد نے، جو کچھ پلیٹ فارم پر اور زیادہ تر باہر تھے، پُرجوش و فلک شگاف نعرہ ہائے تکبیر و زندہ باد سے استقبال کیا۔ نواب صاحب کو ایک شاندار دو گھوڑوں کی بگھی میں بٹھایا گیا، گل پاشی کی گئی اور جلوس کی شکل میں انھیں لے کر مولانا ضیاء الدین علیہ الرحمۃ ...

ں ز مولانا فخرالدین دہلوی علیہ الرحمتہ) کی درگاہ کی طرف روانہ ہوئے، جو جے پور کی شہر پناہ فصیل سے باہر جانب مشرق واقع
رمرجع خاص وعام ہے۔ اسٹیشن سے درگاہ کا فاصلہ تقریباً چار میل ہے۔ یہ جلوس ایسا شاندار تھا جس کی مثال جے پور کی
ریخ میں صرف ایک ہی ملتی ہے، یعنی مولانا ظفر علی خاں علیگ، مدیر روزنامہ زمیندار کے استقبالیہ جلوس کی، مگر وہ بعد کا واقعہ ہے۔

نواب بہادر یار جنگ درگاہ میں پہنچے اور فاتحہ خوانی کی۔ احاطہ درگاہ کے اندر ہی جانب جنوب سات آٹھ فٹ کی
ندی پر ایک وسیع مسطح میدان ہے، جس میں عرس کے موقعہ پر بھی اجتماعات ہوتے ہیں۔ اسی میدان میں ایک بڑا سا مزین تخت
ھا دیا گیا اور اس کے سامنے دائیں اور بائیں دریوں کا فرش تھا اور جو باقی جگہ تینوں رخ پر تھی جہاں فرش نہیں تھا اسے صاف کر کے
کا ساچھڑکاؤ کر دیا گیا تھا تاکہ جو حاضرین فرش پر جگہ نہ پا سکیں اور وہاں زمین پر بیٹھ کر تقریر سننا چاہیں ان کے لیے سہولت
و۔ اسی تخت پر کھڑے ہو کر نواب صاحب نے تقریر فرمائی تھی۔ جے پور میں اگرچہ اس وقت بھی لاؤڈ اسپیکر استعمال ہوتے تھے مگر
معلوم کس مجبوری کی بنا پر منتظمین اس جلسے میں لاؤڈ اسپیکروں کی فراہمی کا اہتمام نہ کر سکے۔ لیکن اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑا کیونکہ
اب صاحب کی آواز اتنی پاٹ دار تھی کہ ڈھائی تین فرلانگ تک ایک ایک لفظ صاف سنا جاتا تھا۔ ان کی تقریر کا اعلان کردہ موضوع
یرت نبوی تھا اور انہیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ حدود ریاست میں سیاست پر قولاً و فعلاً پابندی ہے۔ اس کی نگرانی اور رپورٹنگ کے
کے لیے ریاستی خفیہ پولیس کے آدمی بھی مختلف وضع کے لباسوں میں شریک سامعین تھے۔ چنانچہ نواب صاحب نے تقریر تو سیرت
نبوی پر فرمائی لیکن ملکی اور بین الاقوامی سیاست کا کوئی پہلو ایسا نہیں بچا جس پر سیرت نبوی کے ضمن میں روشنی نہ ڈالی ہو۔ اس
بصیرت افروز تقریر سے حاضرین پر بہت سے ملی و اسلامی نہفتہ گوشے روشن ہوئے اور بار بار پرجوش و بلند آہنگ نعرے اللہ اکبر
ور صلوٰۃ و سلام اور زندہ باد کے لگتے رہے جن کے اثر میں سی آئی ڈی والوں کو اس پر غور کرنے کا ہوش ہی نہ رہا کہ اس تقریر میں
سیاست کو بھی وافر دخل تھا۔ چنانچہ کوئی مخالف رپورٹنگ نہ کر سکے۔ یہ جلسہ بلامبالغہ ایسا تھا جس کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا
ہے کہ شہر بھر کے تمام خواندہ و ناخواندہ بالغ افراد کی اکثریت پر مشتمل تھا۔ میں بھی اس جلسہ میں آخر تک شریک رہا، جو رات
کو تقریباً دو بجے ختم ہوا جس کے بعد نواب صاحب مرحوم اپنے میزبان، حاجی کنور محمد معظم علی خاں صاحب کے مکان موسوم
نواب ہاؤس، واقع ترپولیہ بازار تشریف لائے اور سو سوا سو آدمیوں کی معیت میں عشائیہ تناول فرما کر آرام فرمایا۔

کیونکہ نواب صاحب کی باندی کوئی سے جے پور آنے کی اطلاع سب سے پہلے مجھے برادر عزیز ایم والی خاں نے دی تھی
اور کہا تھا کہ ان کی تقریر میں ضرور سنوں، لہٰذا آں عزیز کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے شب گذشتہ کی تقریر کے
خاص خاص نکات قلمبند کر لیے تھے جنہیں لفافہ میں ڈال کر میں ڈالنے کے لیے گھر سے نکلا۔ لیکن ابھی تک لیٹر بکس تک نہ پہنچا
تھا کہ اتفاقاً منشی امیر الدین خاں صاحب سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ دوران گفتگو رات کے جلسہ اور نواب صاحب کی تقریر پر
بات چیت شروع ہو گئی تو آں موصوف متاسفانہ کہنے لگے کہ "میں رات کی تقریر سے ایسا مغلوب الحال ہو گیا تھا کہ کوئی
یادداشت مرتب نہ کر سکا"۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ "کیا تو نے بھی کچھ نہیں لکھا؟" میں نے جواباً عرض کیا کہ میں نے چھوٹے
بھائی کی دلچسپی کے مدنظر ایک مختصر مگر جامع روئداد جلسہ اور تقریر کی لکھی ہے جو (لفافہ دکھاتے ہوئے) اس لفافہ
میں ڈاک میں ڈالنے کو نکلا ہوں۔ منشی صاحب موصوف نے وہ لفافہ میرے ہاتھ سے فوراً جھپٹ لیا اور چاک کر کے آدھے

صفحات پر مشتمل میری اس تحریر کو وہیں کھڑے کھڑے پڑھ ڈالا اور بولے کہ "بس کام بن گیا" اور رخصت ہو گئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میری وہ تحریر منشی صاحب کی مرسلہ، شاید اگلے ہی مہینے دہلی کے کسی ماہنامہ میں (جس کا نام اس وقت یاد نہیں آرہا ہے) میرے ہی حوالہ سے شائع ہوئی تھی۔

ورودِ ثانی

نواب صاحب مرحوم دوسری بار ۱۹۴۳ء، سر مرزا اسماعیل کے دوران وزارت عظمیٰ میں جے پور تشریف لائے اس زمانہ میں وہاں کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ ان کی آمد پر کسی خصوصی دھوم دھام کا امکان نہیں تھا کیونکہ کچھ عرصہ پہلے ہی وہاں کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لئے جمع ہونے والے مسلمانوں پر فائرنگ کی جا چکی تھی۔ یہ حادثہ عید الاضحیٰ سے تین چار دن پہلے ہی ہوا تھا جس کے نتیجہ میں تقریباً ساڑھے تین سو مسلمان شہید اور اس سے کئی گنا زیادہ مجروح ہوئے تھے اور ہزارہا مسلمان جے پور سے ہجرت کر کے دہلی جا چکے تھے جہاں وہ جامع مسجد کے سنگھاڑوں میں پڑے ہوئے تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ اور دیگر مسلم جماعتوں کے مہمان تھے۔ ہجرت کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی کے متعدد اراکین مولانا غلام بھیک نیرنگ کی قیادت میں باضابطہ تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ مرتب کر چکے تھے اس کے علاوہ مسلمانوں کی دیگر سیاسی جماعتیں بھی اپنے اپنے طور پر تحقیق و تفتیش میں مصروف تھیں۔ اُس زمانہ میں (سلطانہ ڈاکو کیس کی شہرت والے) مسٹر ینگ ریاست جے پور میں انسپکٹر جنرل آف پولیس تھے۔ بدیں حالات یہ ممکن نہ تھا کہ نواب صاحب کا شایان شان استقبال کیا جاتا جیسے پہلی مرتبہ تشریف آوری پر کیا گیا تھا۔

بہرحال مقتدر اور ذمہ دار مسلمانوں کی درخواست پر سر مرزا اسماعیل (وزیر اعظم) نے خصوصی طور پر نواب صاحب کی تقریر کے لئے اجازت دے دی تھی جو پھر مولانا ضیاء الدین علیہ الرحمۃ کی درگاہ میں ہی سیرت نبوی پر ہوئی۔ لیکن چونکہ اس دفعہ نواب صاحب کی تشریف آوری اور تقریر کے لیے اعلان عام کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا وہ تقریر صرف وہی لوگ سن سکے جو درگاہ میں جمعرات کی ہفتہ وار فاتحہ کے لئے جمع تھے۔ اس مرتبہ ان کا قیام بھی بجائے نواب ہاؤس کے جے پور کی ایک معروف شخصیت، اکرام الدین صاحب کے مکان پر رہا جو شہر پناہ کے مغربی دروازہ (چاندپول دروازہ) کے اندر، مشہور فوٹو گرافرس، گوبند رام اودے رام اینڈ سنز کے مکان کے پاس ایک گلی میں واقع تھا۔ اکرام الدین صاحب ریاست کے ایک جاگیردار کی طرف سے وکیل مختار تھے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ ہر جاگیردار کا اسی نوعیت کا ایک وکیل ہوتا تھا جو مختلف ریاستی محکمہ جات میں اس جاگیردار کے معاملات کی وکالت اور مقدمات کی پیروی کرتا تھا۔ حیدرآباد (حیدرآباد (سندھ) میں مقیم مشہور وکیل ارشاد الدین صاحب انھیں کے خلف اکبر ہیں۔

نواب صاحب کی اس مرتبہ آمد پر مہاراجہ کالج کے ہندو اور مسلمان طلبہ کے ایک مشترکہ وفد نے سر مرزا اسماعیل صاحب سے درخواست کی کہ کالج میں نواب صاحب کی تقریر سیرت نبوی پر کرنے کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ اس وفد میں مسلمان اور ہندو، دونوں مذاہب کے طلبہ شامل تھے لہٰذا سر مرزا اسماعیل کو منع کرنے کا کوئی جواز بھی نہ مل سکا۔ ہندو طلبہ کی نمائندگی منشی

چاند بہاری لال صبا کے بڑے صاحبزادے سر جو بہاری لال نے اور مسلمان طلبہ کی وکالت برخوردار م الیاس عشقی سلمہٗ نے کی تھی۔ چنانچہ اجازت مل گئی اور نواب صاحب نے کالج میں تقریر کی جس میں نہ صرف کالج اور اسکولوں کے مسلمان اور ہندو طلبہ ہی بلکہ شہر بھر کے ہندو مسلم شرفاء شریک ہوئے۔ اس تقریر کا کمال یہ تھا کہ اگرچہ جامع مسجد کے حادثہ کا کھل کر ذکر کیا گیا لیکن تقریر سیرتِ نبویؐ کے موضوع سے نہ ہٹی۔ میں اگر حافظہ پر زور ڈال کر اس تقریر کے کچھ اقتباسات پیش کرنے کی کوشش بھی کروں تو اندیشہ ہے کہ موتیوں میں پتھروں کو خلط ملط کرنے سے نہ بچ سکوں گا۔

بہ سبیل تذکرہ اس سلسلہ میں یہ بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ رشید ترابی اور محمد عمر مہاجر نواب صاحب سے مسلسل وابستہ رہا کرتے تھے۔ علامہ موصوف نے نواب صاحب کی فیضِ صحبت سے فنِ تقریر میں وہ کمال حاصل کیا کہ ان کی تقاریر سن کر نواب صاحب مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ عمر مہاجر کو بھی تقریر میں کمال حاصل تھا جس میں اور اضافہ ہوتا لیکن وہ ریڈیو پاکستان کی ملازمت سے ایسے وابستہ ہوئے کہ اس فن کا اظہار نہ کر سکے۔

نواب صاحب مرحوم کو جے پور سے ایک خصوصی ذہنی وابستگی تھی کیونکہ ان کے اسلاف اسی ریاست کے ضلع شیخاواٹی میں واقع دانتہ سے ترک وطن کر کے حیدرآباد دکن پہنچے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ کے دورہ میں وہ وہاں تشریف بھی لے گئے تھے اور اپنے خاندان والوں سے ملاقاتیں بھی کی تھیں اور اپنے آبائی مکانات کی حفاظت کے لئے ضروری اقدامات بھی کئے تھے۔ وہ نسبتاً افغانی قبیلے سدوزئی سے تعلق رکھتے تھے یعنی نسلاً پٹھان تھے۔ ان کے جدِ امجد، جن کا نام بھی بہادر خاں ہی تھا، احمد شاہ ابدالی کے ساتھ اپنی جمعیت کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے اور پھر یہیں رہ گئے اور مختلف مقامات پر پھرتے پھراتے ریاست جے پور کے موضع بالا مقام پر آباد ہو گئے۔ پھر انیسویں صدی کے نصف اول میں یہ لوگ نواب سکندر جاہ کے عہد میں حیدرآباد دکن پہنچے اور مرہٹوں کی شورہ پشتی کے خلاف حکومت کی مدد کی، جس کے صلہ میں ریاست حیدرآباد سے تقریباً چار لاکھ سالانہ کی جاگیر، دو ہزار سوار، نوبت نقارہ، ہاتھی، پالکی اور دیگر اعزازات عطا ہوئے۔ نواب صاحب مرحوم کو اپنے خاندانی شجرۂ نسب کی بھی تلاش تھی جس کے متعلق انھوں نے اپنے ۲۰ر۷ر۱۹۴۱ء کے مراسلہ میں ارشاد الدین صاحب (مذکورہ بالا) کو لکھا بھی تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ اپنی اس جستجو میں کس حد تک کامیاب ہو سکے۔

ان کے پہلے ورود کے بعد ہی سے ان کے تعلقات منشی امیر الدین خاں صاحب سے استوار ہو گئے اور ان پر اعتماد فرمانے لگے تھے اور ریاست کے معاملات کے متعلق انھیں ہدایات دیتے رہتے تھے جیسا کہ ان متعدد خطوط سے واضح ہوتا ہے جو نواب صاحب نے منشی امیر الدین خانصاحب کو بھیجے اور اب ان کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نواب صاحب کی دونوں مرتبہ کی تشریف آوری کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ صرف وہی حالات ہیں جو میرے حافظہ میں تیقن کے ساتھ محفوظ ہیں۔ بوجہ اب بیاسی سال عمر کے جو باتیں مشکوک تھیں ہیں انھیں قلم انداز کر دیا ہے۔ لیکن جو کچھ لکھا ہے اس کا عینی شاہد ہوں کیونکہ اپنی پیدائش سے لے کر ہجرت تک جبکہ میں مہاراجہ ہائی اسکول کی ماسٹری سے ریٹائر ہو چکا تھا، میری عمر وہیں گزری اور ہر قسم کی علمی، ادبی، مذہبی، تعلیمی و تدریسی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا شاہد عینی ہوں۔

سید محمد ریاست علی قادری

بہادر یار جنگ کی مومنانہ شان

نواب بہادر یار جنگ کا نام زبان پر آتے ہی ذہن ایک ایسے مومن صفت انسان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو بیک وقت سیف و قلم ہی کا نہیں بلکہ کردار و گفتار کا بھی غازی تھا۔ نواب بہادر یار جنگ کی شخصیت ایک ایسے مجاہد کی مومنانہ فراست اور قائدانہ صلاحیّت سے بھرپور تھی جس کو دیکھ کر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے نواب بہادر یار جنگ ایک ہمہ صفت وہمہ گیر انسان تھے جنکی ہر صفت اُن کے کردار کی آئینہ دار تھی۔ وہ صاحبِ قلم بھی تھے اور صاحبِ گفتار بھی۔ اُن کی شخصیت کا ہر پہلو درخشاں تھا۔ وہ بہترین صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے۔ اُنھیں ہندوستانی مسلمانوں کے قائدین کی صفِ اول میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے سینے میں ایک ایسا دل تھا جو ہر لمحہ ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے لئے درد رکھتا تھا۔ وہ بے باک اور جری ہونیکے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے سیاستدان، مُدبّر، مفکر، شعلہ بیان خطیب، عاشقِ رسولؐ، شعر و ادب کے رمز شناس، بذلہ سنج اور حاضر دماغ تھے۔ وہ عوام الناس کے دلوں کی دھڑکن اور دین سے محبت رکھنے والے، شریعت محمدیہ کی حفظ و بقا کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے غیور اور اسم با مسمّٰی انسان تھے۔ عوام و خواص میں یکساں مقبول و ہر دل عزیز تھے۔ جس محفل میں پہنچ جائیں اس میں جان پڑ جائے، جس محفل میں نہ ہوں اُن کی کمی محسوس ہو۔

نواب بہادر یار جنگ ایک امیر و کبیر گھرانے کے چشم و چراغ ہوتے ہوئے اپنے سینے میں ایک غریب کا دل رکھتے تھے۔ وہ اُسوۂ صدیقی کا پرتو اور روحِ بلالی کے آئینہ دار تھے۔ اُن کا اُسوہ ابو ذر غفاریؓ کی سیرت کا عکاس تھا اور سلمانِ فارسیؓ کی طینت کا ترجمان تھا۔ وہ عمر بن عبد العزیزؒ کی زندگی کا نمونہ اور ابراہیم بن ادھمؒ کی حیات کے غماز تھے۔ وہ مولانا محمد علی جوہر کی طرح بادشاہِ خطابت تھے۔ عشقِ رسولؐ میں امام احمد رضا خاں بریلویؒ کے جانشین تھے۔ وہ خدا پرستی۔ غیرت دینی۔ حمیت اسلامی روح و ایثار اور بہادری و بیباکی کو جیتی جاگتی تصویر تھے۔

تحریک آزادی اور تقسیم ہند کی جد و جہد میں نواب صاحب کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔ رئیس احمد جعفری کے یہ الفاظ سنہری حروف سے لکھے جانیکے قابل ہیں "مسلم لیگ کی جب بھی کوئی مستند اور مکمل تاریخ لکھی جائیگی تو مورخ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تحریک پاکستان کے عروج و فروغ میں، اُسے عوامی تحریک بنانے میں، اُسے قلبِ مسلمان

ﮐﻦ کی صورت دینے میں بہادر یار جنگ کی دولت شخصیت اور خطابت کا بڑا حصہ تھا»

بہادر یار جنگ نے اپنی پبلک لائف کا آغاز ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ انھیں حیدرآباد دکن کے ایک جلسہ
بی کے موقع پر حیاتِ طیبہ کے موضوع پر بصیرت افروز تقریر کرنے کے بعد نظام دکن نے جو وہاں موجود تھے بہادر یار جنگ کا
عطا کیا۔ نواب بہادر یار جنگ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نشہ میں سرشار ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کی
ندگی بھر مصروفِ عمل رہے۔ تبلیغ دین کی لگن، ذکر میلاد سے دلی رغبت اور سیاسی خطابت سے فطری لگاؤ کی
ے انھوں نے بہت جلد اور کم عمری میں انتہائی عروج حاصل کر لیا تھا۔ اُن کی زندگی کی صحیح عکاسی اُن کے مکتوبات
ی نمایاں ہے جو انھوں نے ہندوستان کے مختلف زعماد اکابر کے نام لکھے۔

اپنے ایک مکتوب میں جناب جمال صاحب کو لکھتے ہیں۔

«کوئی شک نہیں کہ میں اپنے سینے میں ایک بیتاب دل رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہر مسلمان
کو دولت کے اعتبار سے، تقویٰ کے اعتبار سے اور حکومت کے اعتبار سے دنیا میں سب سے
آگے دیکھوں»

ب لکھتے وقت غالباً اُن کی نظر خلفائے راشدین کی طرف تھی اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان حضرت ابوبکرؓ جیسا
حضرت عمرؓ جیسی حکومت، حضرت عثمانؓ جیسی دولت اور حضرت علیؓ جیسا علم حاصل کرنے کی سعی کریں اور اپنی
یں کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے وقف کر دیں۔

ایک جگہ جناب سید محمد عالم صاحب کو لکھتے ہیں

«فی الحال گھر کے تین کمروں میں تین مختلف انجمنوں کے دفتر ہیں شاید آئندہ پورا گھر «بیت الامت»
بن جائے اور میں قوم سے ایک آدھ کمرہ اپنے لئے بھی مانگ لوں»

نوں کی خدمت کرنے کا جذبہ اور اس راہ میں ہر قربانی اُن کی مومنانہ شان کی ایک ایسی جیتی جاگتی تصویر
س سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ قوم و ملت کے لئے کتنا درد اور تڑپ رکھتے تھے۔ وہ دامے
، سخنے ہر طرح اور ہر قیمت پر مسلمانوں کی خدمت کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دنیا
مسلمان یکجا ہو کر اپنے ملی اور بین الاسلامی امور خود طے کریں جس کا اظہار انھوں نے راجہ محمد امیر احمد
صاحب (محمود آباد) سے اپنے ایک مکتوب میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

«اتحاد بین المسلمین کو جو سعی آپ فرما رہے ہیں وہ نہ صرف مبارک بلکہ وقت کی سب سے اہم
ضرورت ہے میں اپنی زندگی کا مقصد اور مسلمانوں کی حیات اجتماعی کی روح اسی سعی کو سمجھتا ہوں»

بہادر یار جنگ نہایت ہوشمند، دور بین اور فیاض تھے وہ آئندہ رونما ہونیوالی حقیقتوں سے
سے سمجھ تاکر لیتے تھے۔ جناب محمد حمید الدین علی خاں صاحب جاگیردار کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

«یاد رکھئے حقیقی عزت مخلوق کی خدمت ہے اور جس جاگیر پر اس وقت ہم کو ناز ہے وہ مجھے

عنقریب افسانہ بنی نظر آرہی ہے" اُن کے اِن جملوں کے ایک ایک لفظ سے حق و صداقت اور اُن کے نیک جذبۂ خدمت اور دور بینی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

ایک جگہ مصوّری کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کسی صاحب کو اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"فنِ مصوّری کو حرفتوں کی تعلیم کا ذریعہ بنانا خان بہادر صاحب کی جدت اور ملک کی مصنوعات کے لئے ایک اچھا شگون ہے۔"

لیکن آگے چل کر جو لکھتے ہیں اُس سے ان کی مذہب اور دین سے گہری وابستگی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

"اس مدرسہ میں بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن کو میں مذہباً جائز نہیں سمجھتا اس لئے اس قدر درخواست کرنا اپنا فرض اور امر بالمعروف کی تعمیل تصور کرتا ہوں کہ اگر مصوّری کو مناظر قدرت اور بے جان اشیاء تک محدود رکھا جائے اور مجسمہ سازی کی بدعت سے حیدر آباد کو جہاں خود بادشاہ کا مجسمہ نہیں بنتا محفوظ رکھا جائے تو مناسب ہوگا۔"

نواب بہادر یار جنگ کچھ عرصہ خاکسار تحریک سے بھی وابستہ رہے بہادر یار جنگ بچپن ہی سے فنون سپاہ گری کی طرف مائل تھے۔ وہ جتنے گفتار میں تیز تھے اُس سے کہیں زیادہ عمل میں چُست تھے۔ وہ ہر مسلمان میں سپاہیانہ اوصاف دیکھنا چاہتے تھے جب انھوں نے مسلمانوں کی سب سے زیادہ غفلت عسکریت کے باب میں دیکھی تو مسلمانوں کی عسکریت کے اُبھارنے کی کوشش کی جس کا عملی ثبوت خود اُن کی خاکسار تحریک سے دلی وابستگی تھی۔ نواب بہادر یار جنگ نے اس تحریک میں رہتے ہوئے وہ دلیرانہ اور قابلِ فخر کام کئے اور اسلام دوستی کے ایسے ایسے ثبوت فراہم کئے جو ایک امیر و کبیر سے تو کیا ایک عام مذہبی انسان سے بھی ممکن نہیں۔ خاکی وردی پہنے ہوئے بیلچہ سنبھالے، ننگے پاؤں شاہراہوں پر بلا تکلف پریڈ کرتے تھے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ نماز میں تساہل پر کوڑوں اور دُرّوں کی سزا نے ناز و نعمت میں پروان چڑھا ہوا امیرزادہ مسکرا کر سہہ گیا۔ گلبرگہ کا واقعہ ہے کہ خاکساروں کے لاکھوں کے ایک اجتماع میں نواب بہادر یار جنگ ایک دن پریڈ میں دیر سے پہنچے جس کی وجہ سے سالار نے سزا کا حکم سنایا کہ اُس جگہ بیس چکّر لگائیں۔ ہزاروں کا مجمع یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ یہ نرم و گداز بستر پر لیٹنے والا، ناز و نعمت کا پلا ہوا امیرزادہ بیلچہ کندھے پر اُٹھائے اطاعتِ امیر کا عملی درس دے رہا ہے۔

تبلیغ دین کے سلسلہ میں جو گرانقدر خدمات نواب بہادر یار جنگ نے انجام دی ہیں وہ ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ نواب صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت آل انڈیا تبلیغِ اسلام کانفرنس منعقدہ بمبئی ۱۹۳۸ء میں بعض اہم نصیحتیں فرمائی تھیں جو یہ ہیں۔

"دوستو! آپ جانتے ہیں کہ اسلام نے تبلیغ مذہب میں جبر و کراہ کو جائز نہیں رکھا۔ قرآن کی زبان اس مسئلہ میں ہر قسم کے ابہام سے پاک ہے۔ (لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ) اور کوئی مسلمان دین کی تبلیغ میں کبھی ایسے فعل کو روا نہیں رکھ سکتا جس میں مکر، لالچ، جبر اور تشدد کو دخل ہو

اس کے باوجود آپ کو اس کا یقین رکھنا چاہیئے کہ جب آپ تبلیغ کے میدان میں قدم رکھیں گے تو جن مصیبتوں سے میں گذر چکا ہوں، اور جن مصیبتوں سے بہ اتباع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر داعی اسلام کو گذرنا چاہیئے وہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں، عزم اور صرف عزم، ارادہ اور صرف ارادہ کی پختگی، استقلال اور صرف استقلال آپ کو منزلِ مقصود سے قریب کر سکتا ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ آپ کے قدم ڈگمگا جائیں اور آپ منزل کو پہنچنے سے قبل ہی نہ رک جائیں۔ آپ کے صاحبانِ ثروت کو چاہیئے کہ اس مبارک ترین کام کے لیے جس کو میں کسی طرح نماز و روزہ سے کم نہیں سمجھتا، اپنے دستِ کرم کو دراز کریں، آپ کے اصحابِ علم و فکر کو چاہیئے کہ زبان و قلم کو حرکت میں لائیں، آپ کے پریس کو چاہیئے کہ اپنے اثرات سے کام لے اور آپ کے ہر فرد کو چاہیے کہ قرنِ اول کے مسلمانوں کی طرح اپنے آپ کو مبلغ اسلام بنائے "

نغ کے لئے سب سے بڑی دشواری سرمایہ کی کمی ہے جو عین وقت پر دامن پکڑ لیتی ہے اور آگے بڑھنے نہیں دیتی، یہ اس لئے نہیں کہ معاندین کے بہر خود غلط الزام کے مطابق آپ اس سے کسی کے ضمیر کو خریدیں بلکہ اس لئے کہ ن کا خرچ برداشت کریں اور ان پر جو مصائب و آلام آئیں ان سے ان کی حفاظت کریں۔ تبلیغ کے لئے دوسری رورت مخلص، سچے اور صلاحیت یافتہ مبلغین کی فراہمی ہے، ایک زمانہ تھا کہ ہم میں کا ہر شخص مبلغ ہوا ا لیکن آج ڈھونڈنے سے ایسے لوگ نہیں ملتے جو تبلیغ کی صحیح صلاحیت رکھتے ہوں۔ تبلیغ کی تیسری ضرورت ں کی ہمدردیوں کا حاصل کرنا ہے، جن کو صدیوں کی صحبت و ہمسائیگی نے چھوت چھات کے اعتبار سے پورا نہیں ا ہندو ضرور بنا دیا ہے، آپ کے مبلغین کو چاہیئے کہ غیروں کو مسلمان بنانے سے پہلے ان مسلمانانِ ہند و صفت لمان بنائیں۔ اپنے تجربہ کی بنا پر میں ایک نصیحت آپ کو کرنا چاہتا ہوں کہ دیہات میں افراد کو مسلمان بنانے ے کوشش کیجیے کہ پوری جماعت مسلمان بنے۔

" اس وقت چند آمادۂ اسلام افراد کو کلمہ پڑھانے میں دریغ کرنا مناسب ہوگا جب تک کہ ان کے اثر سے اس گاؤں کے اکثر اچھوت آبادی کو آمادۂ اسلام نہ کر لیا جائے۔ یہ چند اصولی باتیں تھیں جن کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرائی گئی وہ میدانِ تبلیغ اتنا وسیع ہے کہ ہر روز اس میں نئے تجربوں کی توقع کی جا سکتی ہے "۔

بہادر یار جنگ نے اس وقت محسوس کیا جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ اگر مسلمانوں کو فوراً مسلح یا تو ممکن ہے کہ دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔ نواب ... نے اسی لئے عنایت اللہ خاں مشرقی ری تحریک کا بڑی امید بھری نظروں سے خیر مقدم کیا اور اس میں ... ہو گئے اور مسلمانوں کو بتایا۔

" دوستو! دنیا کے نہ کسی فرد نے تکلیف کے بغیر آرام و راحت کی صورت دیکھی ہے نہ کسی قوم نے جس کو تلاشِ راحت ہے اس کو پہلے مبتلائے مصیبت ہونا چاہیئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ'

فرماتے ہیں۔

فمن طلب العلی سہر اللیالی ۔ اور ہمارا عہد حاضر کا شاعر کہتا ہے۔

میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے ؟ شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

جن قوموں نے اس راز حیات اور سر زندگی کو پہچانا، ان کی رفعت و مرتبت کا پہچاننا دنیا والوں کے لیے مشکل ہو گیا، لیکن جن امتوں نے عالم ذلت و رسوائی میں بھی شمشیر و سناں سے بیگانہ ہو کر چنگ و رباب سے دوستی کی وہ دنیا میں کسی کے لیے قابلِ رشک نہیں رہیں، کیا تم کو ان دنوں کے یاد دلانے کی ضرورت ہے جبکہ دو جہاں کے سردار اور صاحب ولاک خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی راتیں گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر بسر کرتے تھے اور راتوں کو جاگتے جاگتے آپ کے قدم مبارک متورم ہو جایا کرتے تھے ؟ کیا تم نے تاریخ کے ان ایام پر نظر نہیں ڈالی جبکہ فاروقِ اعظمؓ میدانِ جنگ سے آنیوالے قافلے کی تلاش میں مدینہ سے میلوں دور نکل جایا کرتے تھے ؟ کیا تم نے ان دنوں کو بھلا دیا جبکہ دنیا سے چھوٹے بڑے، امیر و غریب اور عرب و عجم کا فرق مٹانے والا، کفر و ایمان کے درمیان ایک خندق کے ذریعہ حد فاصل کھینچ رہا تھا اور اس کے شکم اطہر پر پتھر بندھے ہوئے تھے ؟ اگر یہ سب تم کو یاد ہے تو پھر مجھے تمہاری اس زحمت پر اظہارِ تاسف و ہمدردی کی ضرورت نہیں جو تم نے یہاں برداشت کی ہے، زحمت ناآشنائی اور محنت ناشناسی تو ہماری اس نکبت و ذلت کی ذمہ دار ہے، جس کو محسوس کر کے پھر ایک مرتبہ ہم آمادۂ عمل نظر آتے ہیں، خدا ہمارے ارادوں میں برکت اور ہمتوں میں بلندی عطا کرے ۔"

نواب بہادر یار جنگ پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ عوام الناس میں سے چند ہستیوں نے ان پر بادشاہ پرستی کا الزام لگایا اور دوسری طرف چند موقع پرست لوگوں نے نظام دکن کے کان بھرے کہ یہ عوام کو حکومت کے خلاف بھڑکانے میں پیش پیش ہیں۔ ایسے ماحول میں یہ کتنا مشکل اور صبر آزما کام ہے کہ بیک وقت دونوں فریقین کو باور کرایا جائے کہ وہ نہ تو نظام دکن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور نہ ہی عوام کی بیجا حمایت کرتے ہیں بلکہ وہ ہمیشہ حق و صداقت کے ساتھی ہیں اس کا ثبوت اُن کی ان دو تقریروں سے ملتا ہے جو انھوں نے بھرے مجمع میں کیں۔

" یہ نہ سمجھنا کہ میں شاہ دکن کی خاطر مر رہا ہوں اور جان دے رہا ہوں میں عبدالملک نہیں عبداللہ ہوں، اور دنیا کا کوئی صاحبِ ایمان عبداللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ میں تخت و تاج آصفی پر اس لئے قربان ہوں گا کہ وہ جلالۃ الملک میر عثمان علی خاں کا تخت و تاج ہے۔ کسی فردِ واحد کے لیے میری قربانی نہ شہادت ہے نہ ایثار، اور نہ خدا کے پاس اسی جزا کو زائل کرنا نہیں چاہتا، یہی وجہ ہے کہ میں تخت و تاج آصفی اور اقتدار شاہانِ آصفیہ

"اس لئے قربان ہونا چاہتا ہوں کہ میں اس اقتدار کو ملّتِ اسلامیہ کے اقتدار کا مظہر تصوّر کرتا ہوں اور اقتدار ملّتِ اسلامیہ اعلاء کلمۃ الحق کے سوا کسی اور مقصد کے لئے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا میں حفاظتِ تخت و تاجِ آصفی اور "تحفظِ اقتدارِ شاہی"، کو تحفظ ملّتِ اسلامیہ و اعلاء کلمۃ الحق سمجھتا ہوں اور اسی راستہ میں مٹنے کو موت نہیں بلکہ شہادت اور حیاتِ ابدی تصور کرتا ہوں"

جنگ تقریر کرتے ہوئے ان جملوں کو ادا کرتے ہیں۔

خوب یاد رکھیں میں اس کا دوست نہیں ہوں جو مسلمانانِ دکن کے اقتدار سیاسی و تمدنی کے مظہر اعلحضرت شاہ دکن و برار سے غیر متزلزل وفاداری نہیں رکھتا، میرا ہاتھ اس کی آنکھیں نکال لے گا، جو ان کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ اس کی زبان کھینچ لے گا جو ان کی شان میں ناشائستہ حرکت کا ارادہ کرے۔ وہ ہماری سیاست کے محور ہیں اور ان کے استحکام و بقاپر ہمارے استحکام کا انحصار ہے"۔

بہادر یار جنگ کی نس نس میں روح اسلامی دوڑ رہی تھی اور وہ زندگی کے ہر موڑ اور شعبہ میں اسی روح کو دیکھنا چاہتے اور یہ اسلامی روح ماسوا قرآن حکیم اور سنت نبوی کے کہاں میسر تھی۔ ان ...ر اور گفتگو مذہبی رنگ کی ہوتی تھی - ۱۳۵۹ ھ کے خطبۂ صدارت (مجلس اتحاد المسلمین) کے یہ جملے پڑھکر اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔

"قرآنی تعلیمات کے سوا اور کونسی چیز تھی جس نے ایک بدوی کو تاجِ خسرو اور تختِ کسریٰ کا مستحق بنادیا تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین ہر اس سیاست کو جو قرآن کے منبع فیض سے سیراب نہیں ہے سراب سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی، یہی وجہ ہے کہ انتہائی تنظیمی وسعت کے بعد بھی اس نے جو دستور اپنے لئے مرتب کیا ہے اس میں اپنے وجود کی پہلی غرض اعتصام بحبل اللہ قرار دی۔ زمانہ نے ممکن ہے راستہ میں کچھ تبدیلی کر دی ہو لیکن منزل اگر قرآنی منزل نہیں ہے تو وہ ذلت و خواری کے جہنم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے آج میں آپ کے منتخب کردہ خادم اور اس مجلس کے صدر کی حیثیت سے آپ سب ارکان مجلس اتحاد المسلمین پر عموماً اور ارکان عاملہ و شوریٰ مملکتی مجلس، صدر صاحبان وعہدہ داران مجالس ضلع و ابتدائی اور مبلغین مجلس اتحاد المسلمین پر خصوصاً رکنیت مجلس کی شرط اولین کے طور پر یہ پابندی عائد کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک عمل کی نیت سے اور معنی و مطلب کو سمجھ کر قرآن مجید کی تین آیتیں روز تلاوت کرے اور اس پر نہ صرف اپنے خدا کو گواہ ٹھہرائے بلکہ ماہوار تحریری رپورٹ میں جو مملکتی مجلس کو روانہ کیا جاتا ہے بہ صداقتِ دل اطلاع دے کہ وہ کس حد تک اس شرط کا پابند رہا ہے ________ میرے اس عمل پر مزاولت

نے ثابت کر دیا ہے اور انشاءاللہ بہت جلد آپ پر ثابت ہوگا کہ قرآن کس طرح آپ پر فلاح و صلاح کی انفرادی و اجتماعی راہیں کھولتا ہے۔"

نواب بہادر یار جنگ اپنی زندگی کی آخری سانس تک ملت کی خدمت میں منہمک رہے۔ اُن کی ہر آنے والی گھڑی گزشتہ ساعت سے شاندار اور فیض رساں اپنی عمر کے آخری لمحہ تک اُن کا ستارۂ اوج برابر چڑھتا ہی رہا غرض ۳ رجب ۱۳۶۶ھ، ۲۵ جون ۱۹۴۴ء اسلام کا یہ بطل جلیل اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔

کردار کا غازی

بہادر یار جنگ کا قد لانبا اور بدن دُہرا تھا۔ وہ خد و خال سے مسمر، قریب سے معتبر اور ملبوس سے معزز نظر آتے تھے۔ لوگ انہیں مقرر کی حیثیت سے جانتے تھے اور عام خیال یہی تھا کہ مقرر محنت اور عمل کی جو تلقین اپنی تقریروں میں کرتے ہیں وہ خود اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ڈیماستھنیز نے شجاعت کے بارے میں اتنی شاندار تقریریں کیں کہ ہزاروں آدمی انہیں سُن کر میدانِ جنگ میں جان پر کھیل گئے۔ مگر جب وہ خود میدانِ جنگ میں پہنچا تو موقع ملتے ہی فرار ہوگیا۔ یہ فرار ہمیں ہر ناصح، محتسب اور مصلح کی زندگی میں ملتا ہے۔ لوگ حیران ہوئے کہ بہادر یار جنگ گفتار ہی نہیں کردار کا بھی غازی ہے۔ اپنے بیگانے بھی دُکھ دینے کو تیار ہیں اور یہ اصول کی خاطر ہر امتحان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ بہادر یار جنگ کو جب ایک بار عہدے کی پیشکش ہوئی تو کہا...۔ "مجھے کرسی وزارت پر بیٹھ کر امور مملکت پر غور کرنے کے لیے نہیں بلکہ گردِ کوچہ و بازار بن کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔" بہادر یار جنگ نے یہ طوفان اپنی تقریروں سے اُٹھایا تھا اور اتنے سال گزرنے کے باوجود اس طوفان کی ایک لہر آج بھی میرے دل میں موجزن ہے۔ میں نے انہیں کئی بار سُنا تھا، ان کی تقریر کبھی آتش فشاں ہوتی اور کبھی آبشار بعض تقریروں میں یہ دونوں صورتیں جمع ہو جاتیں۔ وہ تقریریں جن میں برعظیم کی آزادی اور پاکستان کا مطالبہ ہوتا یا ایثار عمل اور سرفروشی اور جانبازی کی تلقین ہوتی بالکل آتش فشاں کی مانند ہوتی، آگ اور حرارت کا سیل بے پناہ جو ہر مقابل پر حاوی ہو جائے اور ہر رکاوٹ پر غالب آجائے۔ جو تقریریں اسوۂ رسول مسلمانوں کی نامسلمانی ایمان کی کمزوری، اتحاد کی کمی، فکر صحیح سے محرومی اور راہِ حق سے انحراف کے بارے میں ہوتیں، وہ ایسے آبشار کی طرح تھیں جو یہ کہتے ہوئے نیچے گر رہا ہو کہ اچھا تم میری سطح تک بلند نہیں ہوتے تو میں بلندیوں سے اُتر کر تمہاری کشت ویران کو سیراب کرتا ہوں۔ عام طور پر جذباتی تقریریں جب احاطۂ تحریر میں لائی جاتی ہیں تو وہ بہت معمولی لگتی ہیں۔

(مختار مسعود)

محمد اطہر النعیمی

نواب بہادر یار جنگ اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

نواب بہادر یار جنگ کا نام سُنکر جو تصور ذہن میں آتا ہے اور جو پیکر منعکس ہوتا ہے کہ یہ شخصیت بھی اسی زمیندارانہ
مدار کی حامل ہوگی رئیسانہ کر و فر زمیندارانہ اور جاگیردارانہ رعب داب اور ان کے لوازمات سب کے سب
جود ہوں گے لیکن جب اس شخصیت کے حالاتِ زندگی نظر کے سامنے آتے ہیں یا ان سے آشنا ہوتے ہیں تو معلوم
ہے کہ یہ شخصیت تو سیرت صدیقی فاروقی و عثمانی کا پر تو تھی سرمایا دارانہ نظام میں آنکھیں کھولنے والا غریبوں
وں الحال لوگوں کا درد رکھنے والا اور ایسے معاشرہ میں ان کے حقوق کے لیے سینہ سپر ہونے والا تھا جس کی حق گوئی
چے زبان زد عام تھے۔

راقم الحروف نے عہدِ طفولیت میں نواب بہادر یار جنگ کا نام سُنا لیکن اس غیر شعوری دور میں جو کچھ سُنا وہ
ِ نسیاں ہو گیا پچھلے دنوں مجھ سے فرمائش کی گئی کہ مجھے نواب صاحب کی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنا ہے تو میں
کا پورا مہینہ اپنی یاد داشتوں کو کھنگالتا رہا تو ذہن کے کسی گوشہ میں مولانا عبدالحامد صاحب قادری بدایونی
مغفور سے سُنی ہوئی چند باتیں یاد آئیں لیکن وہ اس قدر نہ تھیں کہ ایسی ہمہ گیر شخصیت پر ایک مضمون لکھا جا سکے
ند کتابیں مکاتیب بہادر یار جنگ، بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں وغیرہ ہم دست ہو گئیں جن کے جستہ جستہ مطالعہ
ان سطور کے لکھنے کی ہمت ہوئی۔

یہاں اس امر کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے نواب صاحب کی سیاسی اور سماجی خدمات کے علاوہ
نے متاثر کیا وہ ان کا جذبۂ عقیدت و نیازمندی اور سید المرسلین رحمۃ العالمین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ
کے ساتھ رشتہ غلامی کا استحکام تھا نواب صاحب کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ موصوف کو درس قرآن کریم اور
ل میلاد نبوی میں سیرت طیبہ بیان کرنے کا بہت شوق تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ درس قرآن سے نواب صاحب نے
صاحب اور ان کی نظروں نے اس آیت سے رہنمائی حاصل کی تھی ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم
ان کنتم مومنین اسی لئے نواب صاحب اتحاد بین المسلمین کے علمبردار رہے لیکن ذات نبوی علیہ التحیۃ والثنا سے
کا ثمرہ یہ تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ جب تک ذات نبوی سے والہانہ عشق نہ ہو تو سرکار کے فرمان کے مطابق
مل نہیں ہوتا سرکار کا یہ ارشاد گرامی لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ
ں اجمعین یعنی کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ سرکار کی ذات اقدس سے

اپنے والدین اولاد اور ساری عالم انسانیت سے زیادہ محبت نہ رکھے۔

یہی وجہ تھی کہ نواب بہادر یار جنگ عقیدت و احترام کے ساتھ محافل میلاد میں سیرت طیبہ کا تذکرہ کیا کرتے تھے مشہور مستشرق جناب جی الانہ رقم طراز ہیں "ریاست کے اندر اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود وہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے دورے بھی کیا کرتے جہاں وہ میلاد النبی کے جلسوں میں اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے تھے نواب صاحب کی ان تقریروں کو لکھنے اور شائع یا انھیں ریکارڈ کرنے کا کوئی اہتمام نہ ہوا جو آئندہ نسلوں کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہوتیں ان تقاریر میں سیرت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مختلف پہلوؤں کا اس قدر بلاغت اور کمال کے ساتھ ذکر ہوتا تھا کہ اس کی مثال ہندوستان میں مشکل ہی سے ملیگی"

میں نے گزشتہ سطور میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ان کی بے پناہ عقیدت کا تذکرہ کیا ہے اس سلسلہ میں ایک مشہور علمی شخصیت ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے کلمات ملاحظہ فرمائیں۔

"سرور کائنات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات سے ان کو بے پناہ عقیدت تھی یہ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی خود ان کی یا کسی اہل محفل کی زبان پر آتا تو غیر معمول طور پہ متاثر ہوجاتے درس اقبال کی ایک نشست میں غالب کی مشہور نعتیہ غزل کا یہ شعر پڑھا گیا۔

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است   لیکن کشاد آں ز کمان محمد است

تو ان کے سارے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا اور روتے روتے حالت دگرگوں ہو گئی یہاں تک کہ اہل محفل کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ کہیں حرکت قلب نہ رک جائے۔

پاکستان کی ایک اور جانی پہچانی شخصیت جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب نواب صاحب کی خدمت میں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اپنی پبلک لائف کا آغاز ذکر رسول سے کیا وکٹوریہ پلے گراؤنڈ حیدر آباد کے ایک جلسہ میلاد میں بہادر خان نے حیات طیبہ کے موضوع پر بصیرت افروز تقریر فرمائی نظام بھی موجود تھے دوسرے ہی روز بہادر یار جنگ کا خطاب عطا ہوا خود مرحوم نے اپنی مسجد میں بعد نماز فجر ایک گھنٹہ تفسیر سنانے کا اہتمام کر رکھا تھا ۔ وہ تبلیغ کو اپنا مشن بنا لیا تھا کہیں توحید کا نغمہ تو کہیں وحدت کا ذکر کرتے کبھی فاران کی وادیوں کا تو کبھی سینا کی پہاڑیوں پر خطبہ دیتے کبھی صرف حکم لگاتے تو کبھی دعائے خلیل سناتے کبھی اسماعیل کی قربانی تو کبھی حسین کی شہادت کے سبق پڑھاتے۔

ایک اور جگہ پیرزادہ صاحب اس طرح رقم طراز ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد تقریر میں بے نظیر تھے ابوالکلام کی سحر کلامی میں کلام نہیں عطاء اللہ شاہ خطابت کے بجاتے تھے مگر نواب بہادر یار جنگ صحیح معنوں میں لسان الامت تھے ان کی تقاریر عقل کی کسوٹی پر کسی ہوئی الفاظ کے سانچے میں ڈھلی ہوتیں ساتھ ہی زبان میں لطافت اشعار کی شوکت تشبیہات کی دلچسپی اور خیالات کی پختگی ہوا

…ـد فاروقی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مدینہ طیبہ میں مقیم ایک صاحب کی خدمت میں نواب صاحب
…کا حصہ اس طرح نقل کیا ہے۔

…ب بارگاہ اقدس میں حاضر ہیں کسی روز میرے لئے نماز فجر کے بعد جالی سے قریب کھڑے
…جائیے اور عرض کیجیے کہ آپ کا جسم سے دور لیکن دل سے قریب غلام طاغوتی طاقتوں کے ساتھ
…بے سروسامانی کے باوجود برسر پیکار ہے زمانہ اس سے پھر جائے لیکن آپ کی نگاہ لطف کے
…راف کو برداشت نہیں کرسکتا بدر کے ساتھیوں کا صدقہ اُحد کے میدان میں تڑپتے ہوئے
…زہ بن عبد المطلب کا تصدق ذرہ چھبی ہوئی پیشانی کا واسطہ! اس کو اپنا سمجھیے اور اپنے
…ہ قریب کر لیجئے۔

…اروقی صاحب نے نواب صاحب کے خط کا مضمون یہیں تک نقل کیا لیکن اس خط کے آخری جملہ اور
…وجہ آفریں ہیں اس پیراگراف کے خط کشیدہ الفاظ توجہ چاہتے ہیں جس سے صاحبان عقیدت خط حاصل

…آپ کی دعا مقبول ہوگئی تو انشاء اللہ چند مہینے بعد حرم نبوی میں ہوں گا مبارک ہیں آپ کی آنکھیں جو صبح
…آرام گاہ باعث تخلیق کونین کا نظارہ کر رہی ہیں۔ مکاتیب بہادر جنگ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے
…حب مخصوص مذہبی مواقع یعنی شب معراج وغیرہ پر محافل منعقد کرتے تھے چنانچہ اپنے ایک خط میں جو
…سن علی صاحب کے نام ہے (۱۰ جولائی ۱۹۴۲ء تحریر کرتے ہیں)

…ستاد محترم مجھے بالکل یاد نہیں رہا کہ میں نے ہر شب معراج کو مجلس قراء کے انعقاد کا ارادہ کر لیا
…معراج کی شب بہت قریب ہے اس لئے براہ کرم آج قراء کی فہرست روانہ فرما کر ممنون
…یئے تاکہ ان کے نام دعوت نامے جاری کر دیئے جائیں اس محفل کی کامیابی کا تمام تر دار و مدار آپ
…ات کی توجہ پر ہے۔ اور میں خاص توجہ کا امید وار ہوں حسب سال گذشتہ میں مجلس قرأت
…ن مجید کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

…۱۹ء کو مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی کے ایک مکتوب کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔
…ہ سیرت طیبہ میں شرکت ہی میرے لئے کیا کم سعادت ہے کہ آپ مجھ سے صدارت کی خواہش
…اتے ہیں۔ اگر آل انڈیا مسلم لیگ دہلی کے اجلاس کے بعد یہ جلسہ منعقد ہو تو میرے لئے
…ت سہولت ہو گا۔

…ب بہادر یار جنگ تو مہدوی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور خود موصوف نے اپنے ایک مکتوب میں
…۱۹۴ء کو مولوی سید محمود صاحب مدرسہ جانشینان مشائخ مہدویہ کاچی گوڑہ حیدر آباد کو
…موصوف نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ "میں بہر حال مہدوی ہوں"

لیکن مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے "میں نے سنا تھا کہ وہ مہدوی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کی کسی ادا میں فرقہ واریت نہ تھی ایک بار ان کا میلاد نبوی کا بیان بھی میں نے سنا ہے جس میں ایک جملہ بھی ایسا نہ تھا جس میں محسوس ہوتا کہ وہ عامۃ المسلمین سے الگ کوئی عقیدہ رکھتے ہیں۔" میں سمجھتا ہوں کہ نواب صاحب کا مکتوب ابتدائی ہوگا لیکن موصوف کا عقیدہ وہی تھا جو ان کے طرز عمل سے ظاہر ہے علاوہ ازیں نواب صاحب جیسی شخصیت سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں نہ ہو اور ان کے عقیدہ و عمل میں تضاد ہو۔

بہرحال نواب بہادر یار جنگ کی شخصیت ایسی ہمہ گیر تھی جو ملت مسلمہ کے لئے درد بھرا دل رکھتے تھے اور ملت اسلامیہ کے لئے وہ کارنامے انجام دیئے ہیں جو تاریخ کا روشن باب ہیں۔

نواب صاحب کے متعلق اہلِ قلم حضرات بہت کچھ لکھتے رہے ہیں اور ان کی زندگی کے بہت سے پہلو ابھی اور منظر عام پر آئیں گے۔ میں نے اپنی فہم اور عقیدت کے مطابق چند کلمات تحریر کئے ہیں میرے خیال میں وہ فارسی کے اس شعر کے مصداق تھے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

قرآن: قرآن ہدایت ہے۔ قرآن نصیحت ہے۔ قرآن نور ہے۔ قرآن فرقان ہے۔ قرآن دلوں کی بیماری کے لئے شفا ہے۔ نیکوکاروں کے لئے بشیر ہے۔ بدکاروں کے لئے نذیر ہے۔ قرآن کے تمام مقاصد منشاء قیامت تک پورے نہیں ہوسکتے اگر وہ طاق کی زینت بنا رہا۔ قرآن کو مسلم برہمنوں کا گروہ اپنی دکان داری چمکانے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔

آزادی: رسوائی سر بازار چاہتی ہے، ہنگامۂ دار و رسن چاہتی ہے۔ شورش طوق و سلاسل چاہتی ہے اور وہ ہم سے ہماری جان طلب کرتی ہے۔

اگر کمیونزم کی اشاعت کا منشا دنیا سے غربت، استحصال کا خاتمہ اور ہر انسان کے لئے روٹی کپڑا اور مکان کی فراہمی ہے تو میں اپنے آپ کو سب سے بڑا اشتراکی تصور کرتا ہوں اور اگر اس کے پیچھے کارل مارکس کا وہ فلسفہ کام کر رہا ہے جس کی بنیاد انکارِ خدا ہے تو میں کمیونزم سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

(بہادر یار جنگ)

...ل الرحمٰن جعفری

نواب بہادر یار جنگ

برصغیر ہند میں حیدرآباد دکن ایک مسلم ریاست تھی۔ جو خانوادہ آصفیہ کہلاتی تھی۔ میر عثمان علی خاں اس ریاست کا آخری ...تھے۔ یہ ریاست اسلامی ثقافت کا ایک حسین مظہر تھی۔ اور اسلامی انداز کی کسی حد تک نگہبان بھی اس ریاست کے ایک ...ر گھرانے میں ایک فرزند تولد ہوا، نام تھا محمد بہادر خاں یہ اُسی محمد بہادر خاں کے صحیفۂ حیات کے چند اوراق ہیں۔

...بہادر خاں نے عیش و عشرت کے گہوارے میں آنکھ کھولی۔ اور سیم و زر اور حشم و خدم کے انبار میں پرورش پائی طفلی ...سے گزر کر جب جوانی کی سرحد پر قدم رکھا تو عقابی نگاہوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ گلشنِ حیات کی کئی بہاریں شاہد ...ں۔ قدرت نے عقل سلیم عطا کی تھی، اس لیے آنکھوں کے نور نے حقیقت کا سراغ لگایا۔ اور نورِ بصیرت نے حقیقت ...سے لگایا۔

...بہادر خاں کے دیدوں میں برق کی چمک تھی، اور اُن کی زبان میں تیغِ بُراں کی خاصیت اور اُن کا دل کبھی فولاد کی طرح ...جاتا، اور کبھی ابریشم کی طرح نرم بن جاتا یہ متضاد صفات اس ذات میں جمع تھیں جو جاگیردارانہ نظام کا پروردہ ...بڑی انوکھی بات تھی۔ لیکن تاریخ کی آغوش اس سے کبھی خالی نہیں رہی، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ؎

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

...تاریخ بتاتی ہے کہ ایک بُت تراش کے گھر میں ایک موحد پیدا ہوا، بت پرست کے گھر میں توحید پرست کی پیدائش، ...کی پرورش کیا انوکھی بات نہیں؟ لیکن یہ سب قدرت کے کرشمے ہیں۔ اس میں باری تعالیٰ کے ایسے اسرار پوشیدہ ...انسانی نگاہ کا دامن اپنے اندر سمیٹنے پر پوری طرح قادر نہیں ؎ داماں نگہ تنگ و گلِ حُسن تو بسیار

...محمد بہادر خاں کے دل کی وادی بڑی زرخیز تھی۔ دل کیا تھا، ایک شاداب گلستاں تھا جس میں ایمان کے پھول ...عشقِ الٰہی کی کلیاں تھیں، جس میں محبت کا نور تھا، اور جس میں دینِ حق کا ایک چشمۂ صافی تھا، جس سے رشد و ہدایت ...پانی اُبل رہا تھا۔ خدائے بخشندہ نے بہادر خاں کو خطابت کی ساحرانہ قوت دی تھی، اور ان کو حق نگاری کی ...بخشی تھی۔ جب دل مومن ہوتا ہے تو زبان بھی مومن بن جاتی ہے اور قلم بھی مومن بن جاتا ہے۔ چنانچہ بہادر خاں نے ...سے، اور اپنے قلم سے دین کی خدمت کا کام لیا، پہلے اپنے گھر کو، پھر اپنے خاندان کو، پھر اپنے ماحول کو ...تعلیمات سے روشناس کرایا۔ دولت و منصب کی گنہ آلود زندگی کی تاریک گزرگاہوں سے نکال کر عقل و

آگہی کی تابناک شاہراہ پر لا کھڑا کیا پھر یہ ولولۂ دینی اور عشقِ الٰہی کی سرمستی ریاست کی تنگ وادیوں سے نکل کر ہند کی بسیط دنیا میں پھیل گئی، تا آنکہ بہادر خاں کی ایمان و عرفاں میں ڈوبی ہوئی آواز، آوازِ حق بن کر عالمِ اسلام کے دل کی دھڑکن بن گئی۔ بہادر خاں، ایک عالم کا ممدوح بن گیا۔ مذہب اور سیاست دو الگ شئے نہیں، یہ زندگی کی دو شاخیں ہیں۔ یہ صورتاً الگ ہیں لیکن معناً ایک ہیں۔ یہ حقیقت بہادر خاں نے اپنے ہم وطنوں کو بتائی اور سمجھائی۔ اسی احساس نے اتحاد کو جنم دیا اور مسلمانانِ دکن کو جگایا۔ بہادر خاں نے ہمت و جرأت سے کام لیا، اس نے مسلمانوں کے جمود و بے حسی کو توڑا۔ عیش و طرب، اور بے عملی اور غفلت کی زندگی سے نکال عقل و ہوش، اور خودی و خودداری کی زندگی کا سبق سکھایا۔ اقبال کی زبان میں انھیں بتایا کہ

اے طائرِ لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

بہادر خاں برِ صغیر میں قرآن کی حکمرانی کے آرزو مند تھے، چنانچہ جب ہند کے ظلمت کدے میں پاکستان کا نعرہ بلند ہوا، اور اسلامی ریاست کا نقشہ دکھایا گیا تو بہادر خاں مسلم لیگ کے پرچم تلے پہنچ گیا اور شمعِ مصطفوی کا پروانہ بن کر اس میں شریک رہا۔ اور اس نے پوری حریتِ فکر کے ساتھ یہ آواز بلند کی کہ

"میرے خیال میں پاکستان کے لئے ہر سعی و کوشش حرام ہے، اگر پاکستان سے الٰہی اور قرآنی حکومت مراد نہیں ہے۔"

بہادر خاں واقعی اسلام کا ایک بے باک اور جری سپاہی تھا، وہ ایک سر فروش مجاہد تھا وہ ایک مومن قانت تھا۔ اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لئے، اور اسلام کی سربلندی کے لئے بیتاب و بیقرار رہتا تھا۔ اس لئے اپنے جاگیردارانہ ماحول سے بغاوت کی تھی اس نے ریاستی نظام میں مداخلت کی تھی، اس نے سامراجی نظام کی مخالفت کی تھی، لیکن بایں ہمہ اس کے آئینۂ دل میں خوف و ملال کا کوئی ہلکا سا بھی غبار نہ تھا۔ وہ بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا تھا، وہ انجام سے بے پروا تھا۔ وہ ایک شعلہ نوا خطیب بن کر ابھرا تھا، اس کی شیریں نوائوں اور دلنواز ادائوں نے ایک عالم کے قلب مسخر کر لئے تھے، اس کی جنوں خیز باتیں اس کے عشق کی غماز تھیں، یہی خفتہ دلوں کو جگاتی رہیں، اور برِ صغیر میں اپنا اثر دکھاتی رہیں، یہاں تک کہ ہندوستان جاگ اٹھا، اور پاکستان بن گیا بہادر خاں مر گیا۔ اس وقت جب اس نے اپنے گلشنِ حیات کی صرف ۴۲ بہاریں دیکھی تھیں کیسے مرا یہ نہ پوچھو، مرا اس لئے کہ وقت آ گیا تھا۔ اور قدرت کا یہی فیصلہ تھا، وہ مر گیا، اور اس جہانِ رنگ و بو میں اس کا پیکرِ خاکی نظر نہیں آتا، لیکن وہ مرا نہیں بلکہ امر ہو گیا۔ اس نے اپنے صوت و آہنگ کے۔ اپنے عمل پیہم کے۔ اپنے ایمان و تقویٰ کے اپنے ایثار و قربانی کے اور اپنی حق گوئی اور خدا پرستی کے ایسے درخشندہ نقوش دلوں پر ثبت کئے ہیں جو امتدادِ زمانہ سے مٹ نہیں سکتے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بہادر خاں واقعی ایک مردِ مومن تھا، اس کا دل درد و سوز میں ڈوبا ہوا تھا، وہ بے حد رحمدل تھا، وہ سادگی کا مرقع تھا، اور ریاکاری سے دور، وہ تعریف و توصیف سے بے نیاز تھا اس کے دل میں ستائش کی کوئی تمنا نہ تھی،

لہ کا آرزو مند تھا۔ وہ بس قوم کی خدمت کرنا چاہتا تھا، اور وہ مصنوعی آداب کو قواعد کا حصار توڑ کر
اسلامی آداب و شعائر کا پابند بن گیا تھا۔ وہ جاگیردارانہ نظام کی بندشوں کا سخت مخالف تھا۔ اور۔ اپنے
و اطوار سے ہم اپنے چشموں میں، اور ہم سطح لوگوں میں الگ پہچانا جاتا تھا۔ خطابت کی ساحرانہ قوتوں نے جب
میر عثمان علی خاں کو متاثر کیا تو شاہی دربار سے "بہادر یار جنگ" کا خطاب ملا لیکن یہ بہادر خاں
میں مسرت و ابتہاج کی کوئی لہر نہ پیدا کر سکا اور بالآخر وہ اس بوجھ سے سبکدوش ہو گیا۔

محمد بہادر خاں کلام اقبالؒ کے شیدائی تھے، ان کی فکر بھی کلام اقبال کے سانچے میں ڈھل گئی تھی، ان کی تقریر
دونوں میں اقبالؒ کے اشعار کی نمود ہوتی تھی۔ بیت الامت ان کی آبائی رہائش گاہ تھی، وہاں ہر ہفتہ کلام اقبال
درس دیا کرتے تھے اقبالؒ کا کلام پھر بہادر خاں کی زبان سے۔ حسنِ بیان، لذتِ گفتار، اور بیخودی و سرمستی کی
یہ سب باتیں ملا کر قیامت برپا کر دیتیں، اور سامعین یہ پکار اُٹھتے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

خاں بہت نرم خو تھے، رحمدل تھے، ہمدرد و غمگسار تھے۔ غریبوں کے ملجا اور یتیموں کے ماوا تھے۔ زندگی کے
روز میں کوئی لمحہ فارغ نہ تھا۔ وہ ہر وقت کام کرتے تھے اور ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ کثرتِ [illegible] کے
بھی نماز کی ادائی میں خلل نہیں آیا۔ سفر میں حضر میں اللہ کی یاد سے کبھی دل غافل نہیں رہا۔ اور ان کی پیشانی
قاضی الحاجات میں ہمیشہ جھکی رہی۔

بہادر خاں کی ذہانت اور طباعی اوجِ کمال پر تھی۔ جنبشِ ابرو سے وہ دل کا حال معلوم کر لیتے تھے، اور زبان
وہ ان کے سامنے واقعات کی تصویر کھینچ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم وائس چانسلر
علی گڑھ سے عرض کیا کہ میں خفیہ پولیس میں ملازم ہوں مجھے نواب چھتاری سے کہہ کر کسی اور محکمہ میں منتقل کرا دیجئے۔
صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے انھوں نے کہا کہ کسی ایسی دعوت کی تلاش کرو جس میں نواب صاحب مدعو ہوں،
پھر میرے ساتھ چلو، میں ملوا دوں گا۔ ایک روز سرکاری مہمان خانہ راک لینڈ میں پہنچا، اور ڈاکٹر صاحب
سے کہا کہ آج نواب بہادر یار جنگ کے ہاں عصرانہ ہے۔ فرمایا بس میرے ساتھ چلو، میں ساتھ گیا اور بیت الامت
کے وسط میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا، میرا دل بڑی کشمکش میں تھا، میں ناخواندہ مہمان تھا۔ بہادر یار جنگ نے مجھے تاڑ لیا اور تیزی کے
ساتھ میرے پاس آئے اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور بڑی شفقت سے فرمایا "مسلمان چوڑیاں نہیں پہنتا وہ تیغ و سناں سے کھیلتا ہے۔"
[illegible] اور کاغذ میرے حوالہ کیا اور چلدئے۔ میں ان کی اس ذہانت اور فطانت سے بہت متاثر ہوا وہ مجھے سمجھ گئے
لیکن قلب کا یہ لطیف انداز مجھے آج تک نہیں بھولا۔ محمد بہادر خاں اپنی ذات سے ایک مستقل اور فعال ادارہ تھے ایک
انجمن تھے انھوں نے دکن کے مسلمانوں کو خوابِ گراں سے بیدار کیا اور ان کا مقام یاد دلایا، پھر وہ برصغیر کے گوشے گوشے میں
اور اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ انجام دیتے رہے، وہ ایک مردِ مومن اور مردِ مجاہد بنکر جئے اور اسی حال میں موت کی آغوش
گئے۔

[illegible] مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

نواب بہادر خاں بہ حیثیت خطیب

خطاب کے معنی کلام، بات، گفتگو، روبرو بات کہنا، منہ پر بات کہنا، ہیں۔ لیکن جب ہم خطابت کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنی محض تقریر کرنا، لکچر دینا، وعظ کہنا اور خطبہ دینا ہی نہیں ہوتے بلکہ اس سے مراد مجمع کے سامنے آکر ایک خاص فن اور اصول کے مطابق دعوت و تحریک، ترغیب و تحریص، وعظ و تبلیغ، اصلاح و ارشاد کے مقصد سے اظہار خیال و بیان، کے ہوتے ہیں۔

ہندوستان و پاکستان میں اردو کے بہت بڑے خطیب پیدا ہوئے۔ اگرچہ میدان خطابت کے شہسوار "احرار اسلام" (پنجاب) کو سمجھا جاتا ہے لیکن ان کے علاوہ بھی کئی مکاتب فکر کے بعض اصحاب نے خطابت کے فن میں بہت نام پیدا کیا۔ ان ناموران خطابت میں امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا عبدالماجد بدایونی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، آغا شورش کاشمیری کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسلم لیگ کے حلقے میں نواب بہادر خاں جیسا مثال خطیب کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنے جوہر خطابت سے مسلم لیگ کی محفلوں کو سنوارنے اس کے جلسوں کی رونقیں بڑھانے اور اس کی تحریک کو مسلمان عوام میں مقبول بنانے میں ناقابل فراموش حصہ لیا۔

روحانی فکری رشتہ ابوالکلام آزاد سے اور فنی   اسلام سے ملتا ہے۔

خطابت کا فن چند اقسام پر مشتمل ہے اور چند اجزائے بیان کے حسن ترتیب اور ان کی اثر آفرینی سے تکمیل پذیر ہوتا ہے۔ ہم اس مضمون میں نواب بہادر خاں کے جوہر خطابت کا جائزہ لینا چاہتے ہیں لیکن مناسب ہوگا کہ پہلے خطابت کے اقسام اور ان کے اجزائے ترکیبی پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

خطابت کی قسمیں۔ خطابت دو قسم کی ہوتی ہے پہلی قسم علمی یا موضوعی خطابت کی ہے اور دوسری قسم عوامی خطابت کی ہوتی ہے۔ ان دونوں قسم کی خطابت کو ہند پاکستان کے دو بڑے خطیبوں کے رویے میں تلاش کیا جا سکتا

پہلی قسم۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ کسی جگہ خطاب کرنے سے پہلے تنہائی کے چند لمحوں کے متلاشی ہوتے تھے۔ ان چند لمحوں میں وہ اپنے اجزائے بیان کو ذہن میں مرتب کر لیتے تھے اور علمی مجامع میں خطاب سے پہلے تو وہ موضوع بحث و خطاب پر ماخذ و منابع علمی سے رجوع فرما لیتے تھے اور اپنے خطاب کے انداز

اسلوب، بیان و استدلال اور تفصیل و حدود کے بارے میں پوری طرح غور فرما لیتے تھے اور پھر اس ذہنی فیصلے کی پوری طرح پابندی کرتے تھے۔ اس لئے ان کے خطبات اپنے موضوع پہ بیان و استدلال اور اسلوب خطابت کے نادر نمونے ہیں۔ ان میں تفصیل بھی ہے لیکن موضوع سے متعلق اور ان میں اجمال کی خوبی بھی ہے لیکن وضاحت و استدلال کی تشنگی کے احساس کے بغیر۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہمیشہ اور ہر تقریر سے پہلے اس قسم کی تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک سول نافرمانی کے زمانوں میں ایک ہی موضوع پر ہر جگہ تقاریر ہوتی تھیں۔ اس لئے ان میں ایک بار کی تیاری اس تحریک کے پورے دور کے لئے کافی ہوتی تھی۔ یہ تقاریر انداز و اسلوب کے لحاظ سے نکھرتی اور دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتی جاتی ہیں، استدلالات بھی موقع و محل کی تبدیلی سے بدلتے رہتے ہیں لیکن تقریر و خطاب کا بنیادی نکتہ اور مواد ایک ہی رہتا ہے۔ اس قسم کی خوبی کا اندازہ کسی سینیر پروفیسر کے لکچر میں بہ آسانی کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اس کے موضوعات وہی میر و غالب، حالی، اقبال اور ان کا فکر و فن ہوتا ہے لیکن سال بہ سال کے تجربے اور بیان کی مشق و مزاولت سے اس کا فن خطابت اور انداز و اسلوب بیان خوب سے خوب تر اور دلکش سے دلکش ترین کا نمونہ بنتا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسے اس میں ایسا کمال حاصل ہوجاتا ہے کہ کسی نئے ذہین ترین استاد کے لکچر میں وہ دل ربائی اور اثر آفرینی ناپید ہوتی ہے۔ خطابت کی یہ قسم علمی و موضوعی کہلاتی ہے۔

دوسری قسم امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری برعظیم کے بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اپنے کسی خطاب کے لئے پیشگی تیاری نہ کرتے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ وہ اپنی تقریر کا مضمون عوام کی نگاہوں سے چنتے ہیں۔ اس لئے ان کی خطابت کا انداز مولانا آزاد کے انداز خطابت سے بالکل مختلف ہوتا تھا۔ وہ مجمع کے ذوق و رجحان کا اندازہ کر کے اپنی تقریر کا آغاز کرتے تھے، پھر اپنے موضوع کی طرف پلٹ کر آگے بڑھتے تھے اور حالات وقت، مسلک و مشرب اور دعوت و تحریک کے متعلق جو بات مجمع کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے، کرا دیتے تھے اور اس طرح اپنے مقصد خطاب میں کامیابی حاصل کرتے تھے۔ اس خطابت کو عوامی خطابت کہا جاتا ہے۔ کسی خطیب کے جوہر خطابت کی اصل پرکھ ایسی ہی صورت حال میں ہوتی ہے کہ مجمع مخالف ہے اور وہ خطیب کے مسلک و تحریک کے متعلق کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں لیکن خطیب کا کمال یہ ہے کہ وہ انھیں نہ صرف اپنی بات سننے پر مجبور کر دیتا ہے، بلکہ اسے منوا بھی لیتا ہے اور اپنے اور اپنے مسلک کے حق میں تحسین و آفرین کے نعرے بھی لگوا لیتا ہے۔

خطابت کی ان دونوں قسموں میں خطیب کے پیش نظر یہ مقصد ہوتا ہے کہ اس کے سامعین ایک صحیح انداز فکر اختیار کریں، ان کے پاس معلومات و استدلات کا ایک مناسب ذخیرہ جمع ہوجائے اور خطیب کی پیش کردہ دعوت کو غور و فکر کے بعد اپنے فیصلے اور عزم و استقامت کے ساتھ قبول کریں اور اس کی تحریک کا ساتھ دیں۔

ایک اور قسم۔ خطابت کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے۔ ہم اسے بحث و جدل کا نام دے سکتے ہیں یا مناظرہ

یا ڈیبیٹ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مقصد فریق مخالف کو عاجز و لاچار اور جواب سے ساکت کر دینا ہوتا ہے۔ اس کے لیے فن خطابت میں کسی کمال کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ قصہ، مثال، لطیفہ، پھبتی، جملہ، طنز، تعریض، تضحیک، تمسخر وغیرہ جس طرح بھی مخاطب کو عاجز، سامع کو مبہوت اور مجمع کو متحیر کیا جا سکے، کر دینا اور مقدمہ کو جیت لینا ہی مقصد ہوتا ہے اگر یہ ایک خوبی ہے تو اسے ایک ذہین اور کامیاب وکیل کے کردار میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس میں خطابت کا مقصد چونکہ احقاق حق نہیں ہوتا اس لئے خطیب اپنے سامع کو غور و فکر اور فیصلے کے لئے نہ مہلت دیتا ہے، نہ آزاد چھوڑتا ہے۔ تاریخ ملت اسلامیہ ہند، پاکستان کے کئی بڑے سیاست دان جن کی خطابت کے کمال کے بہت لوگ قائل ہیں، ان کی بنیادی حیثیت وکیل، مناظر، یا محض ڈیبیٹر کی تھی۔ نواب بہادر خاں کی خطابت میں اول الذکر دونوں عناصر خطابت کی بہترین خوبیاں پائی جاتی تھیں۔

خطابت کے اجزائے ترکیبی: خطابت چند اجزائے بیان کے حسن ترتیب اور ان کی اثر آفرینی کا نام ہے۔ لیکن جب ہم اجزائے بیان، اور ان کے حسن ترتیب کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو بات پوری نہیں ہوتی۔ اجزائے بیان میں تو صرف زبان کی صحت، انداز بیان اور فصاحت و بلاغت ہی کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن خطابت جن بے شمار دیگر و ماورائے چند اجزائے بیان است۔ خطابت میں علم و مطالعہ، قوت حافظہ و خوبی استحضار بھی شامل ہوتی ہے اور سرعت فہمی، حاضر دماغی اور بدیہہ گوئی یا حاضر جوابی کا عنصر بھی شریک ہوتا ہے، لیکن ایک مکمل خطابت کا نقش پھر بھی ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ ابھی ان اجزائے ترتیب میں شخصیت کا سحر، آواز کا جادو، اندازہ شناسی کا جوہر اور بیک نظر مجمع کو بھانپ لینے کی خوبی شامل کرنا باقی ہے۔ اگر ان تمام اجزائے خطابت کو ترتیب دیا جائے تو صورت حال یہ سامنے آتی ہے۔

۱۔ (الف) شخصیت

(ب) آواز

۲۔ (الف) مطالعہ

۳۔ (ب) علم و استدلال

۴۔ (الف) حافظہ

(ب) قوت استحضار

یہ خطابت کے لازمی اجزا ہیں۔ ان کے بغیر خطابت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان اجزا کی کیفیت اور کمی بیشی سے خطابت کا حسن نکھرتا اور معیار قائم ہوتا ہے اور خطیب کی انفرادیت اور اس کے خصائص کا نقش اُجاگر ہوتا ہے۔

اوپر کے اجزا کو چار مجموعوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ ان پر قدرے تفصیل سے اظہار خیال کر لیا جائے۔

ا۔ شخصیت۔ ایک خطیب سب سے پہلے اپنی شخصیت کا اثر اپنے مخاطبین اور سامعین پر چھوڑتا ہے۔ اس
لے کہ وہ اپنی آواز فضا میں بلند کرے اور اپنی خطابت کے سحر سے لوگوں کو مسحور کرے، وہ اسٹیج پر نمودار
اپنی شخصیت کا نقش، گہرا یا ہلکا حاضرین کے دلوں پر ثبت کر دیتا ہے۔ شخصیت کا تصور
بنیادی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ وکیل، سیاستداں، عالم دین، پروفیسر کی شخصیت کا تصور ایک دوسرے
ل جدا اور مختلف ہوتا ہے۔ شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ڈیل ڈول، لباس، وضع، قطع، وقار، تمکنت، سادگی
شامل ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا شوکت علی کا جثہ، ابوالکلام کی تمکنت، حسرت موہانی کی سادگی، مولانا مودودی کی نفا
خطابت سے الگ اور اظہارِ خطابت سے پہلے، ایک تاثراتی قیمت تھی۔ بعض اوقات خطیب کا ایک دلربا یا نر
وضع کی کوئی شان، یا کوئی خاص ادا ہی ناظرین کو متاثر اور مسحور کر دیتی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا اندازِ دلربائی
چہرہ، سپید داڑھی، ہاتھ میں تبر، قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے پٹھے بال، سر کے بیچ سے نکلی ہوئی مانگ، کبھی
پر بالوں کی ایک لٹ، شورش کاشمیری کی بے نیازی ہی ناظرین کو مست و بے خود بنا دیتی تھی۔
شخصیت کے تاثرات کو گھمبیر بنا دینے والی ایک اہم چیز "آواز" ہے۔ آواز بھاری، بلند اور دبنگ ہو یا باریک اور
ہو، اس سے سامعین کے تاثرات پر خاص اثر نہیں پڑتا، لیکن آواز میں لوچ ہونا اور مقرر اور خطیب کا اس پر قابو ہونا
اصل جان ہے۔ بعض اوقات آواز کی یہ خوبی کسی خطیب کو وہبی طور پر ملی ہوتی ہے لیکن سعی اور مشق سے اس صلاحیت
ا ہی نہیں پیدا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس خوبی کا اندازہ تو کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھوں نے عطاء اللہ شاہ بخاری
ن احمد شجاع آبادی کی تقریریں سنی ہیں۔ شاہ صاحب کے ایک دلدادہ رشید اسکھ کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ مجھے تو صرف
احب کا قرآن پڑھنا اچھا لگتا ہے۔
نواب بہادر خاں کی شخصیت پر نظر ڈالیے تو کئی خوبیاں نظر آجاتی ہیں۔ ان کی شخصیت بلند و بالا تھی، باوقار
وہ اپنی مخصوص وضع سے پہچانے جاتے اور ناظرین کے قلوب پر ایک گہرا نقش چھوڑتے تھے۔ ان کی آواز بلند اور رنگ
اور استدلال کی قوت سے پہلے ان کی آواز کا آہنگ ہی سامعین کے قلوب کو متاثر کر دیتا تھا۔
ان۔ ضمن میں زبان کی صحت، تلفظ کی نفاست، بیان پر عبور اور زبان کے مختلف لہجوں کے استعمال پر عبور۔
ان کے مختلف لہجوں کے استعمال پر قدرت کی بحث آتی ہے۔ لیکن کسی مجمع عام میں زبان کی صحت اور تلفظ کی نفا
اندازہ شناس کم ہوتے ہیں۔ اس لیے صحت کے تاثر کے مقابلے میں لہجے کی سحر انگیزی کا دائرہ
وسیع اور اس کا تاثر زیادہ گھمبیر ہوتا ہے۔ جن شائقین نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو اردو کے علاوہ
اور سرائیکی کے مختلف لہجوں میں خطابت کے موتی بکھیرتے دیکھا ہے زبان و بیان پر عبور اور تلفظ کی نفاست
لہجے کی سحر انگیزی کا اندازہ کچھ وہی کر سکتے ہیں۔
بہادر خاں اگرچہ پنجابی سرائیکی کے لہجوں سے واقف نہ تھے، اس لیے ان کی تقریر میں اس خاص تاثر کی توقع نہیں
ہیے لیکن وہ اردو کے دکنی اور شمالی ہند کے خاص لہجوں سے واقف تھے، زبان کی صحت کے اندازہ شناس

تھے اور بیان پر انھیں عبور حاصل تھا۔ ولی، غالب، اقبال کے کلام اور شبلی، سلیمان اور آزاد کی نثر کے مطالعے نے ان میں زبان کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیا تھا اور اس کے باوجود کہ ان کا تعلق دکن سے تھا، وہ شمالی ہند کے کسی بھی اہلِ زبان کے مقابل لائے جا سکتے تھے۔

۳۔ علم و مطالعہ۔ ایک خطیب کے لئے اپنے موضوع تقریر اور اس کے متعلقات کا علم ہی کافی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے بہت وسیع دائرے میں مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح ایک کامیاب وکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کا مطالعہ ایک ملک کے اور ایک قسم کے قانون تک محدود نہ ہو بلکہ مختلف ممالک، مختلف اقوام، مختلف ادوار کے قوانین اور ان کے نظائر پر نظر ہو۔ اسی طرح کوئی سیاست داں کامل درجے کا سیاست داں نہیں ہو سکتا بشرطیکہ وہ محض وکیل یا ڈبیٹر نہ ہو۔ جب تک مشرق و مغرب کی تاریخ، تہذیب، روایات اور سیاسیات پر اس کی معلومات پوری اور تازہ نہ ہو۔ اسی طرح کوئی خطیب، خصوصاً اردو زبان کا خطیب، خطابت کے اعلیٰ درجے پر فائز نہیں ہو سکتا جب تک اسے اسلامی تعلیمات، اصول، تاریخ اسلام، تاریخ مسلمانانِ ہند و پاکستان، مسلمانوں کی تہذیب، روایات، تعلیم، تحریکات، مختلف مسالک و مشارب اور اس کے ساتھ ہند و پاکستان کے خاص ماحول، تاریخ، تہذیب، روایات اور مختلف مذاہب، ان کی تاریخ اور تعلیمات سے کم از کم ضروری حد تک واقف نہ ہو۔

استدلال کا تعلق بھی علم ہی سے ہے۔ خطیب کی کامیابی کا دار و مدار ادعا و بیان پر نہیں ہوتا بلکہ ادعا و بیان کے ثبوت کے لئے استدلال کی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ استدلال تاریخی، مذہبی، منطقی، عقلی، قانونی، موقع و محل کے لحاظ سے کسی قسم کا بھی ہو سکتا ہے۔ تاریخی استدلال یہ ہو گا کہ اپنے مسلک، رویے اور رائے کے لئے تاریخ سے استشہاد کیا جائے، مذہبی استدلال یہ ہو گا کہ قرآن، حدیث یا مذہب کی تعلیمات اور اصول کلیات کی روشنی میں پیش کردہ واقعات و حالات میں رہنمائی تلاش کی جائے۔ منطقی و عقلی استدلال یہ ہے کہ عقل اسے تسلیم کرتی ہو اور منطق سے اسے ثابت کیا جا سکے۔ قانونی یہ ہے کہ قانون و دستور میں اس کے جواز کے ثبوت کے لئے دفعات اور گنجائش ہو اور تاریخ قوانین و دساتیر میں اس کے لئے نظائر موجود ہوں۔ استدلال کا کام بعض قول اور یا اشعار سے بھی لیا جاتا ہے۔ استدلال اگرچہ بذاتہ خطابت نہیں لیکن خطابت کے تاثرات کو محکم اور کا نقش دیر پا بنانے میں اس کا عمل نہایت شدید، قوی، زود اثر اور دیر پا ہوتا ہے۔

نواب بہادر خاں میں یہ خوبی موجود تھی۔ ان کا مطالعہ نہ صرف اسلام کی تاریخ اور مذہب کے اصول و مبادی تک وسیع تھا بلکہ وہ ہندوستان کے مختلف مذاہب کی تاریخ اور ان کی تعلیمات اور تاریخ اسلام و مسلمانانِ ہند و پاکستان بلکہ تاریخ ہند کے قدیم ترین ادوار، ان کے مختلف گوشوں اور تاریخ عالم کے نشیب و فراز اور اقوام عالم کے عروج و زوال کی تاریخ سے بھی واقف تھے۔ وہ استدلال کے ہر حربے کو استعمال کرنے میں مشاق اور اس سے کام لینے میں بے مثال تھے۔ ان کے علم و مطالعہ اور استدلال کی انہی خوبیوں نے انھیں ہند و پاکستان کے عظیم خطیبوں کی صف میں جگہ دلا دی تھی۔

ی کمالات ۔ ایک خطیب کبھی فن کی معراج تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک اس کا حافظہ نہایت قوی نہ ہو اور استحضار
ذہنیت بہت عمدہ نہ ہو، اگر خطیب کا حافظہ اچھا نہ ہو، وہ کبھی تاریخ بھول جائے، کبھی کسی شخصیت کا نام
یاد نہ آئے، کبھی کسی واقعہ کی جزئیات یا کوئی خاص پہلو اس کا حافظہ فراموش کر دے، کبھی کوئی مصنف یا اس
کتاب کے نام اور حوالے کے لئے وہ تقریر کے دوران میں ایک لمحے ہی کے لئے سوچنے لگے یا اور کسی قسم کی معلومات
وہ صحیح تاریخ اور درست اعداد و شمار بتانے کے بجائے اندازے اور تخمینے سے کام لے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا شخص
بلند پایہ خطیب ثابت نہیں ہو سکتا۔

ایسا شخص بھی کبھی اعلیٰ درجے کا خطیب نہیں بن سکتا جس کا حافظہ گو خراب نہ ہو لیکن استحضار کی قوت کم اور
ذہنی کا مادہ ضعیف ہو۔ خطیب کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اگر کسی مجمع میں روانی اور جوش کے ساتھ
کر رہا ہے تو اسی روانی اور سرعت کے ساتھ موضوع کی مناسبت سے اسے حالات، واقعات، دلائل، براہین، اشعار،
نظائر یاد آتے رہیں اور موقع و محل کے مطابق لطائف و قصص سے سامعین کے لئے تفریح طبع کا سامان فراہم کر سکے۔
اگر بیان کی روانی اور خطابت کے جوش اور استحضار اور انتقال ذہنی کی رفتار میں توازن اور مناسبت نہ ہو تو
بت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایسی خطابت صرف ادعائے بلند بانگ، قلب کے جوش، جذبات کی شدت، بیان کی روا
اچھا نمونہ ثابت ہو سکتی ہے لیکن اس کا نقش دیرپا ثابت نہیں ہو سکتا۔

اگر خطابت کے یہ تمام اجزائے ترکیبی کسی خطیب کے فن میں پائے جائیں یا ان میں سے بیشتر موجود ہوں تو ا
پائے کا خطیب تسلیم کر لینا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا، یہ خطابت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ خطابت کے حسن اور
کے لئے چند اور شرائط کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خطابت کا حسن اسی وقت نکھرتا ہے جب یہ شرائط بھی موجود
، مثلاً حسنِ مزاح، ذوق شعر و ادب، حاضر جوابی، نکتہ آفرینی۔

نواب بہادر خاں میں یہ خوبیاں موجود تھیں اور ان خوبیوں نے ان کی خطابت کو چار چاند لگا دیئے تھے اور
نظیر خطیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔

بہادر یار جنگ کا اندازِ فکر

حانی اشتراکیت: اسلام محض مسلمانوں کی خدمت نہیں سکھاتا اور صرف مسلم مفاد کا درس نہیں دیتا۔ سچا انسان بننے کے لئے سچا
ان بننے کی ضرورت ہے۔ آج سے تیرہ سو سال پہلے اسلام نے سچی روحانی اشتراکیت کا پیام دیا تھا۔ اسلام نہایت خوش
ولی سے غریب و امیر کا فرق و امتیاز ختم کرتا ہے۔"

اشی نظام: دنیا کے تمام نظام ہائے معاشی کو سامنے رکھ کر اسلامی نظام معاشی کا تقابلی مطالعہ
جائے اور اسلامی نظام معاشی کو ایک قابل عمل مرتب شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

(بہادر یار جنگ)

سید نور محمد قادری

نواب بہادر یار جنگ اپنے خطوط کی روشنی میں

نواب بہادر یار جنگ مرحوم تحریکِ آزادی کے نڈر سپاہی، علامہ اقبال کے سچے معتقد، قائدِ اعظم کے جاں نثار اور بلند پایہ خطیب تھے، جہاں تک اُن کی خطابت کا تعلق ہے وہ بجا طور پر "نادرِ روزگار" کے مستحق تھے۔ تحریکِ پاکستان کے اجتماعوں میں اُن کے حسنِ خطابت اور زورِ بیان کی وجہ سے بہت رونق ہوتی تھی۔

تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما اور بدایوں کے قادری خاندان کے چشم و چراغ مولانا عبد الحامد بدایونی مرحوم (۱۹۷۰ء) سے جب حافظ محمد اسلام صاحب نے یہ سوال کیا "سنہ ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں یا اجلاس کے موقع پر پیش آنے والا کوئی واقعہ بتائیے جس نے آپ کو متاثر کیا ہو اور اب تک آپ کو یاد ہو" [1]

تو آپ نے جواباً فرمایا۔

"اجلاس لاہور کی دو باتیں ایسی تھیں جنہوں نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ اول مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنماؤں کا جذبۂ ایثار و قربانی۔ دوم نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی وہ یادگار تقریر جس نے خواص و عوام میں جدّ و جہد کے لئے ایسا جذبہ ابھارا کہ چند ہی مہینوں میں ہندوستان کا گوشہ گوشہ قیامِ پاکستان کے مطالبہ سے گونج اٹھا" [2]

نواب صاحب صرف خطابت ہی کے نہیں قلم کے بھی دھنی تھے۔ اُن کی تحریر میں بھی وہی جادو اور معنی آفرینی تھی جو اُن کی تقریر کا خاصہ تھی۔ آج سے پندرہ سال پہلے "بہادر یار جنگ کمیٹی" نے اُن کے منتخب خطوط کا مجموعہ بنام "مکاتیبِ بہادر یار جنگ" کراچی سے شائع کیا ہے جو نواب صاحب کے چھ سو خطوط کا قیمتی مجموعہ ہے اور ان خطوط میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک خط میں ہوتا ہے۔ یہ خطوط نواب صاحب کے مذہبی معتقدات، سیاست سے اُن کی دلچسپی، تحریکِ پاکستان سے ذہنی اور عملی وابستگی، احباب سے روابط و مراسم اور شعر و ادب سے اُن کے گہرے لگاؤ کا دلچسپ اور جامع مرقع ہیں۔

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے اور اُسی کو جانچنے کا بہترین پیمانہ اُس کے خطوط ہوتے ہیں۔ کیونکہ مکتوب نگار اپنے محرمِ راز دوست سے خط میں وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے، جو عام حالات میں زبان پہ لانے کا روادار نہیں ہوتا۔ پنجابی زبان کے ایک محبت بھرے گیت میں عاشق اپنی خواہش کا اس طرح اظہار کرتا ہے۔

"میں ہو واں توں ہوویں تے بس خدا دی ذات ہو وے"۔ تقریباً یہی بات مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے

---

[1] روزنامہ جنگ، استقلال پاکستان ایڈیشن ۱۹۷۰ء [2] ایضاً

درمیان ہوتی ہے۔ وہاں بھی تیسری ذات صرف خدا تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے۔ یعنی کسی راز کے افشا ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا اور موج میں آئی ہوئی طبیعت ہر بات کہہ جاتی ہے۔ یہ صفت نواب صاحب کے خطوط میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مولا کریم نے نواب صاحب کو "علم البیان"، کی صفت سے پوری طرح نوازا تھا اور تمام خطوط میں یہ صفت جاری و ساری ہے۔ وہ ابلاغ و ترسیل میں کہیں بھی عاجز نہیں ہوتے۔ مکتوبات کے دیباچہ میں مکتوبات کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ہمدانی نقوی صاحب لکھتے ہیں۔

"خط اس طرح لکھنا کہ مخاطب کے استعداد فہم سے بالاتر نہ ہو۔ اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو اور اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اپنا پیغام مخاطب کے دل کی گہرائیوں تک پہنچے بغیر بھی نہ رہے۔ بہت دشوار کام ہے یہ وہی کر سکتا ہے جسے خدا نے حضرت خواجہ گیسو دراز کے الفاظ میں "سخن" کے لئے مخصوص کر لیا ہو۔ نواب صاحب کے یہ مکاتیب "اسی سخن طرازی" کا بہترین نمونہ ہیں" ؎۱

مزید فرماتے ہیں :-

" نواب صاحب کے مکاتیب کی سیاسی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان کی ادبی حیثیت میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان مکاتیب کی زبان نواب صاحب کی گفتگو ہے۔ جس میں تقریر کی لذت بھی ہے، جذبات کا آہنگ بھی، خلوص کی تڑپ بھی ہے۔ وہ زندگی کے بے لاگ اور بیباک ناقد ہیں اور حق کے اظہار میں کسی قسم کی جھجھک محسوس نہیں کرتے۔ ادب اگر زندگی کا عکاس ہے تو نواب صاحب مرحوم کا یہ [illegible] مکاتیب بھی یقیناً اردو ادب کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے"

ہمدانی نقوی صاحب سے ہمیں حرف بحرف اتفاق ہے۔ یہ مکتوبات واقعی ایک بیش بہا سرمایہ ہیں اب ہم ان خطوط کی رو سے نواب صاحب کی زندگی کے چند گوشوں کو ذرا تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔

نواب صاحب اور کلام اقبال

نواب صاحب کلام اقبال کے سچے عاشق تھے۔ یہاں تک کہ حضرت علامہ کی کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھیں۔ ہر جمعرات کو اپنے مکان پر درس اقبال کی مجلس قائم کرتے تھے وہ خود اور دوسرے ماہرین اقبال حضرت علامہ کے اشعار کی تشریح و تفسیر بیان کرتے۔ تحریر و تقریر میں حضرت [illegible] کے اشعار کو برمحل استعمال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ مکاتیب میں بھی انھوں نے حضرت علامہ کے اشعار [illegible] استعمال کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نگینے جڑ دئے ہیں۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں عید کے موقع پر جو عید کارڈ چھپواتے ہیں اسے حضرت علامہ اقبال کے کلام سے مزین کرتے ہیں۔ [illegible] ایک دوست قاضی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں۔

"قاضی صاحب عید کارڈ آپ کو پہنچے گا۔ اس پر میں نے اقبال کے یہ دو شعر اب کی مرتبہ لکھے ہیں۔

؎۱ مکاتیب بہادر یار جنگ کراچی ۱۹۶۷ء ص ۳۲-۳۳

یہ عقل جو ماہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار ؛ شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل ؛ دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں لہ

تحریکِ پاکستان کے زمانے میں حمید نظامی مرحوم تحریکِ پاکستان کے چند بڑے لیڈروں کی غیر اسلامی روش اور بیانات سے بہت نالاں تھے اور اس بے یقینی کا شکار ہو گئے تھے کہ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو کہ نہ ہو جب انھوں نے نواب صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے نظامی صاحب کو کلامِ اقبال پڑھنے کا مشورہ دیا اور جب نظامی صاحب نے لکھا کہ کلامِ اقبال کے مطالعہ سے مایوسی کے اندھیرے چھٹ گئے ہیں تو انھوں نے جواباً تحریر فرمایا "یہ سنکر اقبال سے میری عقیدت بڑھ گئی کہ ان کے مطالعہ نے آپ کی بے یقینی کو یقین کے راستے پر ڈال دیا۔ ایمان کی صحیح منزل جس سے آپ اپنے کو محروم سمجھتے ہیں اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میں آنکھوں کے پہنا ؤ کو قلب کا وصل کیا کرتا ہوں۔ خدا آپ کی اس رقت کو اور بڑھائے" ؎۲ بنگلور کی ایک تقریر میں مرکزی نکتہ

حضرت علامہ کا یہ شعر تھا ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا ؛ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

انھوں نے دورانِ تقریر اس شعر کی جو تشریح اور معانی بیان کئے ایک صاحب حبیب اللہ کو اس سے اختلاف تھا چنانچہ انھوں نے اپنے اختلاف کو ایک خط میں عرض کیا تو نواب صاحب نے اس شعر کے معنی و مفہوم پر جو جواباً روشنی ڈالی ہے وہ ان کی شعر فہمی کا بیّن ثبوت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"تقدیرِ الٰہی کا مسئلہ گذشتہ تاریخِ اسلام کے ہر دور میں انتہائی معرکۃ الآرا مسئلہ رہا ہے...... آپ نے تقدیر کی وضاحت کی ہیں اس سے بالکل متفق ہوں اور اقبال کے شعر کو اس تعریف کے بھی خلاف نہیں پاتا۔ تقدیر کا بدلنا کسی مخلوق کی طاقت سے قطعاً ممکن نہیں...... میں اقبال کا مطلب یہی سمجھتا ہوں کہ نگاہِ مردِ مومن، خدا کو آمادۂ تبدیل تقدیر کر دیتی ہے۔ اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ انسان خود تقدیر کو بدلتا ہے اور یہاں نگاہِ مردِ مومن سے مومن کی اپنے خدا کی طرف التجائی نگاہ ہے جو خدا کے فضل و کرم سے اکثر و بیشتر مقبول ہوتی ہے اور خدا ہی کے حکم سے کبھی کرامت کبھی خوارقِ عادت اور کبھی معجزہ کی صورت میں ظاہر ہوتی اور یہی نگاہِ التجائی، ایمانِ کامل، اطاعتِ غیر مشروط اور راضی بہ رضائے الٰہی ہونے کی وجہ سے خدا کی رضا و پسندیدگی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب میری اس تقریر میں کوئی اشکال باقی نہ رہا ہوگا" ؎۳

نواب صاحب اور حضرت قائداعظم

اس موضوع پر کچھ کہنا تحصیلِ حاصل سے زیادہ نہیں نواب صاحب قائداعظم کا سچے دل سے احترام کرتے۔ ان کے ہر حکم اور مشورہ کو واجب التعمیل سمجھے اور اپنے آپ کو ان کا ادنیٰ خادم کہتے اور مانتے۔ اس مجموعہ میں درج جو خطوط ہیں جو عظیم قائد سے محبت، اخلاص اور شیفتگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ہم یہاں صرف ان تاثرات کی ایک جھلک پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جو نواب صاحب کے دل

لہ مکاتیب بہادر یار جنگ کراچی ۱۹۶۸ء ص ۳۷۷/۳۷۸ ؎۲ ایضاً ص ۵۴۶ ؎۳ مکاتیب بہادر یار جنگ کراچی ۱۹۶۸ء ص ۵۵/۵۵

دماغ پر اپنے محبوب قائد کی پہلی ملاقات کے دوران ثبت ہوئے تھے۔

۱۹۳۳ء کا زمانہ ہے نواب صاحب بمبئی میں ایک عید میلاد النبی کے جلسہ کی صدارت کر رہے ہیں قائدِ اعظم بھی زعماء کی صف میں تشریف فرما ہیں۔ نواب صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد سٹیج پر تشریف لاتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار جس طرح کرتے ہیں وہ نواب صاحب کی زبان سُنیئے۔

"خطبۂ صدارت ختم ہوا اور تکبیر کے نعروں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور علی (کرم اللہ وجہٗ) کے ناموں سے نسبت رکھنے والا عقل و دل کے جباعین ہر خود بھی عرش کی سیر کرنے لگا اور اپنے سامعین کو بھی فرش سے بلند کرنے لگا۔ تقریر مختصر تھی جس کے ابتدائی جملے میرے لئے سند تھے اور آخری حصہ قانونِ محمدی کا دنیا کے دوسرے مشہور قوانین خصوصاً "رومن لاء" سے متقابل مطالعہ تھا۔ موجودہ قوانین کا ایک عالم متبحر جس کی زندگی "رومن لاء" کی ذریات کو اپنی آغوش میں پرورش کرتے ہوئے گزری۔ جب محمدی قانون کے گوشے کھولنے لگا تو آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ تعلیم مغرب کے شیدائیوں نے حسنِ محمدی کے کیسے کیسے جلوے دیکھے ہوں گے۔ برخاست کے وقت مجھے تعارف کی مسرت حاصل ہوئی اور دوسرے دن "لٹل گبز روڈ" کی مختصر مگر آراستہ کوٹھی میں ملاقات کا شرف نصیب ہوا" ؎۱

مکتوبات کی ادبی حیثیت

مکتوبات ادبی لحاظ سے بھی اہم مقام کے حامل ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(الف) ایک دوست نواب صاحب کو حقہ اور تمباکو ہدیۃً ارسال کرتے ہیں۔ نواب صاحب اس تحفۂ گرانمایہ کا اس طرح شکریہ ادا کرتے ہیں۔

"تمباکو اور نے پہنچی۔ مولانا روم نے نَے کی زبان سے شکایت کروائی لیکن جب سے آپ کا تمباکو پی رہا ہوں میرے حقہ کی نے سے نغمہ ہائے تشکر نکل رہے ہیں۔ کمرہ معطر ہے، میں مسرور ہوں اور میری زبان سے پھول اور قلم سے موتی نکل رہے ہیں" ؎۲

(ب) جناب مرزا فرخ دہلوی "یومِ ظفر" میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں تو نواب صاحب جواباً ارشاد فرماتے ہیں۔

"اس دن کی تیاری کیجئے جس دن آپ تیمور صاحبقرانی، بابر فاتح ہندوستان اور شہنشاہ عالمگیر کی صحیح معنوں میں یاد منانے کے قابل ہو جائیں۔ آنکھوں سے چلتا آؤں گا اور اپنی عقیدت کے بوسوں سے آپ کے دست و پا کو رنگین کر دوں گا جو کچھ کہا گیا وہ آپ کی تنقیص کے لئے نہیں بلکہ قلب میں سلگتی ہوئی آگ کی چند چنگاریاں تھیں جو بے ساختہ نکل پڑیں۔ معاف کیجئے آپ کے دکھتے ہوئے دلوں کو اور دکھانا مقصود نہیں بلکہ مردہ دلوں میں جو شرابِ ادب سے موتِ سرمدی کا سامان کر رہے ہیں بلکہ حیاتِ ادبی کے لئے تڑپ پیدا کرنا مقصود ہے" ؎۳

(ج) قاضی فصیح الدین صاحب کو لکھتے ہیں۔

؎۱ ایضاً ص ۵۱۰ - ۵۱۱ ؎۲ ایضاً ص ۲۷۲ ؎۳ ایضاً ۶۳ - ۶۴

"آپ کی بارگاہِ محبت کا ایسا سخت مجرم ہوں کہ خط کے ذریعہ بھی آنکھ ملاتے شرم آتی ہے۔ گذشتہ ہفتہ حیدر آباد جس قیامت میں مبتلا رہا ہے اس سے آپ واقف ہوں گے۔ اب کچھ سانس اعتدال پر آئی ہے"[1]

(د) اپنے ایک بے تکلف دوست خواجہ نواب صاحب کو تحریر کرتے ہیں۔

"اب تو آپ کی ملاقات عید کے چاند کی ملاقات سے زیادہ دشوار ہو گئی مجھ رند تدرح خوار سے پوچھو یہ شیخت تم کو کچھ سجاتی نہیں۔ دنیا کارگہِ عمل ہے اس کو بھی تم نے عزلت گزینی میں گزار دیا تو اللہ میاں کے سوال کا کیا جواب کہ زندگی میں کیا کر آئے۔"

اللہ مجبوروں کی چار دیواری کے اندر نہیں، آفاق کے ذرہ ذرہ میں بے کسوں کی آہ و بکا میں، بے وسیلوں کے نالہ و شیون میں، مظلوموں کی کراہ میں، داد خواہوں کی تڑپ میں ملے گا۔ باہر نکلو اور دیکھو کہ اشرف المخلوقات انسان، حاملِ بارِ امانت انسان، خلیفۃ اللہ انسان کس طرح ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ کہیں یہ خط حضرت شیخ کو نہ دکھا دینا کہ مجھ بیچارے غریب کی کفر کے فتووں سے تواضع ہو۔ تصور میں تم سے گلے مل رہا ہوں اور تمہاری مقدس داڑھی کو بوسہ دے رہا ہوں۔ میری نہیں سنتے تو سعدی کی سنو۔ ع

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست به تسبیح و سجادہ و دلق نیست[2]

(د) سیٹھ قاسم علی کی وفات پر سیٹھ زکریا منیار کو لکھتے ہیں۔

"آپ کا اعلانِ جلسۂ تعزیت قلب پر بجلی بن کر گرا۔ کاش میں گزشتہ جلسۂ تبلیغ میں نہ آتا قاسم علی بھائی کے یہاں مہمان نہ رہتا۔ اُن کے گھر کی آبادی نہ دیکھی ہوتی۔ کہیں میری ہی نظر تو نہیں لگ گئی۔ ہائے کتنا نیک آدمی تھا۔ دولت مند ہو کر کتنا منکسر المزاج کروڑپتی ہو کر کتنا خدا ترس"[3]

(ہ) نواب امین الدین خاں صاحب کو آم ارسال کرنے کا شکریہ اس طرح ادا کرتے ہیں۔

"آم پہنچے، گو ان کی شیرینی آپ کی یاد کی مٹھاس سے کم، اور ان کا مزہ آپ کے لطفِ محبت کے مقابلے ہیچ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خوب لطف سے کھایا، اور ایک پٹھان سے آموں کے ساتھ جس قدر انصاف کرنے کی آپ توقع کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ اُن کے ساتھ انصاف کیا گیا"[4]

دوستوں سے حُسنِ سلوک

سچی دوستی کے قائل تھے۔ آڑے وقت میں کسی قسم کی اعانت سے دریغ نہ کرتے مولانا ظفر علی خاں صاحب سے گہرا لگاؤ تھا۔ اُن کا انگریز دشمنی کی بنا پر حیدر آباد سے ملنے والا وظیفہ اور بقایا رُکا ہوا تھا۔ وظیفہ کو جاری کرانے کے لئے نواب صاحب نے ہر قسم کے ذرائع سے امداد کی۔ نواب سعید احمد خاں چھتاری اور ملک غلام محمد صاحب معتمد فنانس کو ذاتی خطوط لکھے۔ بلکہ ملک غلام محمد صاحب (سابق گورنر جنرل پاکستان) کے پاس تو مولانا کے لڑکے اختر علی خاں صاحب خود نواب صاحب کا سفارشی خط لیکر گئے۔

---

[1] ایضاً ص ۱۰۸-۱۰۹ ۔ [2] ایضاً ص ۱۲۵/۱۲۶ [3] ایضاً ص ۱۳۳-۱۳۴ [4] ایضاً ۳۰۷-۳۰۸

خر مولانا نے "احتیاج" کے ہاتھوں اپنا وظیفہ بحال کروانے کے لئے کئی سالوں سے انگریزی حکومت کی مخالفت بند کر رکھی تھی۔ بلکہ اپنے اخبار "زمیندار" کے ذریعے حکومت کے ہر فعل کی تائید کرنی شروع کر دی تھی۔ احتیاج واقعی بڑی بلا ہے، نہ کے شیروں کو روباہی پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں نواب صاحب کا حیدرآباد کے انگریز ریذیڈنٹ سر آرتھر ورتھیان کے نام کا خط بڑا معلومات افزا اور عبرت کا خزینہ ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"آپ شاید اس سے واقف ہوں کہ مشہور لیڈر مولانا ظفر علی خاں جو اب سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں اپنی سیاسی زندگی شروع کرنے سے قبل حیدرآباد میں ملازم تھے۔ وہ یہاں سے ریٹائر ہوئے اور کئی سال تک پنشن پاتے رہے۔ اس کے بعد بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ شاید گورنمنٹ آف انڈیا کی مولانا سے ناراضی کی بنا پر حکومتِ حیدرآباد نے گورنمنٹ آف انڈیا سے اپنی روایتی دوستی کے تقاضے سے ان کا پنشن بند کر دیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں مولانا ظفر علی کی پالیسی گزشتہ چار پانچ سال سے حکومتِ برطانیہ کے لئے قابلِ اعتراض نہیں رہی ہے۔ مجھے ان کی وہ تقریر یاد ہے جو جنگ شروع ہونے کے چند دنوں بعد ہی شملہ کے اجلاس سنٹرل اسمبلی میں انھوں نے کی تھی اور جنگ میں ہندوستان کی امداد پر زور دیا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک ان کے اخبار نے (War Activities) میں حکومت کی تائید کی ہے اور میں نے حکومتِ پنجاب اور صوبہ سندھ کے بعض ذمہ دار عہدہ داروں کی تحریریں دیکھیں جن میں زمیندار کی ان خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ مولانا اب اپنی عمر کے آخری (stages) سے گزر رہے ہیں اور یہ واقعہ حیدرآباد کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہوگا کہ جس شخص نے حکومتِ حیدرآباد کی خدمت کی اس کا جائز معاوضہ حیدرآباد کی طرف سے روک دیا جائے۔ میں نے حکومت حیدرآباد کے ذمہ دار اصحاب سے اس مسئلہ پر گفتگو کی تو مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ اس خالص اندرونی مسئلہ میں بھی وہ معلوم کرنے کے منتظر ہیں کہ اب ظفر علی خاں صاحب کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا کی پالیسی کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس اطلاع سے آپ کو خود تعجب ہوگا۔ تاہم میں نے مناسب سمجھا کہ خانگی طور پر آپ کی توجہ اس طرف مبذول کراؤں اگر آپ بھی مجھ سے متفق ہیں کہ یہ معاملہ حیدرآباد کی حکومت ہی کے غور کرنے کے قابل ہے اور اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا مولانا ظفر علی خاں کی موجودہ پالیسی کے مدِنظر گورنمنٹ آف انڈیا کو کوئی عذر نہیں ہے کہ حیدرآباد ان کی مستحقہ پنشن کا بقایا ان کو ادا کر دے اور آئندہ ان کے نام پنشن جاری کر دے تاکہ وہ اپنی بقیہ عمر اطمینان سے گزار سکیں تو از راہِ کرم اپنے اس خیال کا کسی ملاقات میں نواب صاحب چھتاری یا خود مجھ سے اظہار فرما کر مجھے اور مولانا ظفر علی خاں کو ممنون فرمائیے۔"[۱]

ایک مولانا ظفر علی خاں ہی نہیں بلکہ انھوں نے ہر موقع پر اور ہر وقت اپنے کسی دوست کو مایوس نہیں کیا اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ اس مسئلہ میں انھوں نے محض اپنے ایک دوست کے "احتیاج" سے مجبور ہو کر ان اصحاب سے رابطہ قائم کیا جن سے وہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے کبھی نہ ملتے۔

پردہ پوشی | نواب صاحب کے خیال میں اگر کوئی شخص مسلمانوں کی خدمت کے لئے کام کر رہا ہے اور اس دوران

۱۔ ایضاً ص ۵۵۳ تا ۵۵۵

رہی نے بشری تقاضوں سے مجبور ہو کر کچھ غلطیاں بھی کی ہیں تو ان خامیوں اور غلطیوں کو اچھالا نہ جائے اسی طرح بجائے فائدہ کے نقصان ہو سکتا ہے اور جمعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ چنانچہ مرکزی سیرت کمیٹی کے صدر عبدالمجید قریشی صاحب پر جب دس بارہ ہزار روپیہ خورد برد کرنے کا الزام کسی حد تک ثابت ہو گیا تو انھوں نے پھر بھی یہ تلقین کی کہ ان باتوں کو زیادہ ہوا نہ دی جائے اگر قریشی صاحب قوم کا روپیہ کھا بھی گئے ہیں تو کیا ہے کام بھی تو وہی کر رہے ہیں۔ مرزا امان اللہ بیگ صاحب کو لکھتے ہیں۔

"قریشی کو اپنے حال میں کام کرنے دیجئے۔ مسلمانوں کا پانچ دس ہزار روپیہ اگر انھوں نے کھا بھی لیا ہے تو اس کام کے مدنظر جو انھوں نے کیا میں اُن کو قابل معافی سمجھتا ہوں اور آپ کو اپنے تجربہ کی بنا پر یقین دلاتا ہوں کہ اختلاف کے جوش میں کمیٹیاں بن جائیں گی۔ قریشی کے خلاف سارے ہندوستان میں شور مچ جائے گا۔ سیرت کمیٹی کا چلتا ہوا کام رک جائے گا۔ ہزاروں بندگانِ خدا جو سیرت کی تحریک سے عقیدت رکھتے ہیں بدظن ہو جائیں گے۔ چند روز تک یہ سارے ہنگامے رہیں گے اور چونکہ ان ہنگاموں کی تہ میں تخریب کا جذبہ کام کرے گا اس لئے چند دنوں میں ساری تحریک فنا کے گھاٹ اتر جائے گی۔ میری مخلصانہ رائے ہے کہ قریشی صاحب کی زندگی تک اُن کو نہ چھیڑا جائے۔ کام کرنے دیا جائے" [1]

نواب صاحب کی سیرت کی یہ چند جھلکیاں [2] اُن کے خطوط کی روشنی میں مرتب کی گئی ہیں جو اصحاب تفصیل میں جانا چاہتے ہیں وہ مکاتیبِ بہادر یار جنگ کا مطالعہ فرمائیں۔

---

[1] ایضاً ص ۱۷۷ - ۱۷۸ [2] نواب صاحب کے مذہبی معتقدات کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر الیاس مرحوم کا مکتوب ۳۲ فروری ۱۹۴۲ء اشاعت "نقوش" لاہور خطوط نمبر اپریل مئی ۱۹۶۸ء صفحہ ۳۰۲۔ نیز مکتوب نواب صاحب بنام مولوی سید محمد صاحب مکاتیب بہادر یار جنگ صفحہ ۱۳۴۔ نیز نقوش محولہ بالا صفحہ ۳۰۹، نواب صاحب کا تفصیلی خط بنام محمد علی ایم۔ اے لاہور، مکاتیب بہادر یار جنگ صفحہ ۳۰ - صفحہ ۳۸

سید مصطفیٰ علی بریلوی

نواب بہادر یار جنگ اور منشی امیرالدین خاں جے پوری

نواب بہادر یار جنگ ایک لاجواب مقرر، مفسر قرآن، شارح اقبال اور مسلمانانِ ہند کی سیاست کے نبض شناس رہنما تھے۔ ان سب اعلیٰ صفات کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان میں مردم شناسی کی صفت بھی بدرجۂ اتم ودیعت کی تھی۔ اس بات کا اندازہ ان شخصیات کی طویل فہرست پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بخوبی ہو سکیگا جن کو نواب ممدوح کے مکتوب الیہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آج ہم نواب صاحب کے مخاطب ایک قومی تعلیمی کارکن منشی امیرالدین خاں رامپوری ثم جے پوری کا مختصر تعارف ان خطوط کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں جو نواب صاحب نے اپنی حیات مستعار کے آخری چند برسوں میں وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے تھے نواب بہادر یار جنگ کے خطوط اب سے تقریباً ۲۵ سال قبل بہادر یار جنگ اکادمی کراچی نے شائع کئے تھے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے ریسرچ اسکالر ان خطوط پر کام کریں اس طرح نہ صرف ہماری علمی و سیاسی اور تاریخی حالات و واقعات کی نئی توضیحات سامنے آئیں گی بلکہ اس طرح ہمارا آفتاب دکن بھی اپنی جملہ تابانیوں کے ساتھ ضوفگن ہو سکے گا۔

منشی امیرالدین خاں ــــ سوانحی خاکہ

سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک جہاں جہاں پہنچی وہاں بے لوث قومی خادموں، تعلیمی کارکنوں اور دردِ ملت رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی۔ ان ہی مخلصین کی شب و روز کی کاوشوں کے نتیجے میں مسلمانانِ ہند میں سیاسی شعور بیدار ہوا اور اُن کا زندہ قوموں میں شمار کیا جانے لگا۔ صوبہ سرحد میں سر عبدالقیوم، پنجاب میں سر محمد شفیع، سر فضل حسین، سندھ میں حسن علی بے آفندی، یو پی میں نواب محسن الملک، وقار الملک، سید محمود، راس مسعود، مولوی بشیرالدین خاں بہادر، مولوی عبدالحق، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مولوی طفیل احمد، بمبئی میں مولوی رفیع الدین، بہار میں سر علی امام، بنگال میں سر عزیز الحق، مولوی فضل حق، راجپوتانے میں بہلول خاں دانا، جیسے بے شمار افراد دن رات قومی خدمت اور مسلمانوں میں علم کی روشنی پھیلانے کے عظیم مشن پر لگ گئے۔ بدقسمتی سے ہماری نئی نسل اپنے ان عظیم محسنینِ ملت کے کارناموں سے ناواقف ہے۔ اسی گروہ اصفیا کے ایک نہایت نامور بزرگ منشی امیرالدین خاں جے پوری تھے۔ اُن کے نواب بہادر یار جنگ سے قومی سطح کے روابط تھے چنانچہ نواب صاحب نے منشی امیرالدین خاں کے نام جو خطوط لکھے ہیں وہ تمام تر قومی مسائل پر مبنی ہیں۔ اُن کی تفصیل اور پس منظر ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔

منشی امیر الدین خاں، ریاست رام پور کے رہنے والے تھے۔ اُن کے جد بزرگوار حاجی رحیم الدین خاں علاقہ روہ نزد افغانستان سے ہجرت کرکے وارد روہیل کھنڈ ہوئے تھے۔ ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ والیٔ اودھ کی ناعاقبت اندیشی اور انگریزوں کی ملک گیری کی ہوس نے ریاست روہیل کھنڈ کا خاتمہ کر دیا۔ حافظ رحمت خاں شہید ہوئے۔ روہیلوں کی باقیات صالحات میں رام پور کی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ ریاست رام پور میں صرف دس ہزار روہیلہ خاندانوں کو رہنے کی اجازت دی گئی۔ باقی بے شمار خاندانوں کو کمال بے دردی کے ساتھ روہیل کھنڈ بدر کر دیا گیا۔ ہزاروں ہزار روہیلے اس انقلاب میں اس بری طرح تباہ و برباد ہوئے کہ نام و نشان مٹ گیا۔ روہیلوں نے اس ظلم کے خلاف تقریباً ایک صدی تک جہاد جاری رکھا۔ اس تفصیل سے قطع نظر عرض یہ کرنا ہے کہ منشی امیر الدین خاں کا خاندان اُن خوش نصیبوں میں شامل تھا جنھیں گوشۂ عافیت، رام پور میں قیام کی اجازت دی گئی۔ ان کے دادا مولوی جلال الدین خاں، فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ حافظ احمد علی خاں شوق، اپنی تصنیف تذکرہ کاملان رامپور میں لکھتے ہیں۔ مولوی جلال الدین احمد خاں جلالی، ولد حاجی رحیم الدین خاں قوم افغان محلہ بجرانہ وغیرہ رام پور میں رہتے تھے، بہت باوقار، کم سخن اور بافہم تھے۔ عربی و فارسی میں اعلیٰ استعداد تھی۔ صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند تھے، فارسی اور اردو زبانوں میں کبھی کبھی نظم بھی کہتے تھے۔ مولوی سراج الدین احمد خاں رام پوری اور معز الدین خاں نائب بخشی افواج جے پور دو فرزند ہیں۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں منشی صاحب کے نانا اکرم خاں اور دادا جلال الدین خاں نے [illegible]۔ اُن کے چچا مولوی سراج الدین خاں، حامد ہائی اسکول رام پور میں ہیڈ مولوی تھے۔ مولوی سراج الدین خاں اور نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کے بھائی نواب زین العابدین خاں کے درمیان گہرے دوستانہ روابط تھے۔ جب زین العابدین خاں اپنے نواب بھائی سے اختلافات کی بنا پر جے پور چلے گئے تو اولاً مولوی سراج الدین خاں اور پھر منشی امیر الدین خاں کے والد معز الدین خاں مع خاندان جے پور ہجرت کر گئے۔ احترام الدین شاغل جے پوری اپنی کتاب تذکرہ شعرائے جے پور میں رقم طراز ہیں۔

(سراج الدین احمد خاں) جے پور میں برسوں نائب فوجدار (اسسٹنٹ مجسٹریٹ) کے عہدے پر مامور رہے، پھر رامپور جا کر فتاویٰ عالمگیری کے ترجمہ کے عملہ میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد ہائی اسکول رامپور میں عربی کے مدرس رہے۔ رام پور میں ہی انتقال ہوا۔ کبھی کبھی فارسی و اردو میں طبع آزمائی فرماتے تھے۔ معز الدین خاں حافظ تھے اور عربی فارسی پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے ریاست جے پور کی فوج میں ایک معمولی ملازمت اختیار کی لیکن ترقی کرتے کرتے نائب کمانڈر انچیف کے عہدے تک پہنچے۔ وہ بھی گہرا علمی و ادبی شغف رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں صاحب تذکرہ شعرائے جے پور لکھتے ہیں۔

اعلیٰ علمی و ادبی ذوق تھا مگر ملازمت مصروفیات کے باعث یہ جوہر چمک نہ سکا۔ خوش خلق، بامروت، ہمدرد، متواضع اور مرنجان مرنج تھے۔ نظم و نثر میں کئی تصانیف چھوڑی تھیں ...... تعجب ہے کہ مولوی

…یرالدین خاں شوخ اور پروفیسر حامی الدین خاں صاحبان جن کو اُن کی تعلیمی خدمات کی بنا پر علی الترتیب، جے پور کا سرسید اور جے پور کا محسن الملک کہا جا سکتا ہے، جیسے بیٹوں کے ہوتے ہوئے مرحوم کا علمی و ادبی سرمایہ مفقود ہے۔

ہندوستان میں جب مسلمان آئے تو راجستھان میں اُن کو غیور اور بہادر راجپوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف مسلم علماء، صلحا، شرفاء اور صوفیائے کرام نے اسلام کا پیغام محبت گھر گھر پہنچایا۔ دوسری طرف میدانی مقابلے ہوتے چنانچہ آج بھی راجستھان کا شاید ہی کوئی پہاڑ، تنگنائے، جنگل، ندی، نالہ ایسا ہو کہ جہاں کوئی نہ کوئی مسلمان غازی یا شہید آسودۂ خاک نہ ہو۔ مسلمانوں کے سیاسی اور اخلاقی غلبہ کے نتیجہ میں ریاستیں عملاً مغلیہ حکومت کا نمونہ بن گئیں۔ ان علاقوں میں صدیوں تک مسلمان برابری کی بنیاد پر عدل و انصاف کے ماحول میں زندگی گزارتے رہے لیکن جب دنیشنلزم کے سنپولوں نے صورت حال یکسر بدل کر رکھ دی اور آہستہ آہستہ مسلمان ان پر پڑتے گئے۔ اُن کی تعلیمی و اقتصادی پس ماندگی حد کو پہنچ گئی۔ منشی امیرالدین خاں اس گھٹے ہوئے ماحول سے دل برداشتہ ہو کر اپنے ابتدائی دور میں جے پور سے باہر تعلیم حاصل کرنے چلے گئے عربی، فارسی اور علوم متداولہ کے وہ گھریلو تعلیم و تربیت کی وجہ سے بخوبی ماہر ہو چکے تھے البتہ اسناد کی کمی تھی اس لیے انھوں نے ۱۹۰۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا شوکت علی کے رسالہ "خدام کعبہ" کی ادارت سنبھالی۔ پھر مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار "ہمدرد" کے لئے آپ کی خدمات حاصل کیں۔ یہ وہ دور تھا جب مسلم یونیورسٹی بنانے کی تحریک کا بڑا زور بندھا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں منشی امیرالدین خاں نے ایک مشہور نظم لکھی جس کے دو شعر بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے ؎

دولتِ دنیا نہ لے اور دولتِ اسلام لے
اپنے علم و فضل کی گرتی عمارت تھام لے

ہے فضائے دہر ذکر و شغل سے پُر صبح دم
مسلم خوابیدہ اُٹھ تو بھی خدا کا نام لے

منشی امیرالدین خاں کی علی برادران سے وابستگی اور قومی جوش و خروش ریاست جے پور کے دربار کو کس طرح گوارہ ہو سکتا تھا چنانچہ آپ کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔

تعلیمی خدمات

منشی امیرالدین خاں نے مسلمانانِ ریاست جے پور کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کی مہم کا آغاز ۱۹۲۵ء میں کیا۔ یہ داستان خود منشی صاحب کی زبانی سنئے :

۱۹۲۵ء میں ایک مکتب محلہ چابک سواروں کی اونچی مسجد میں نیازمند نے جاری کیا اور مسٹر شہاب الدین کو دس روپیہ مشاہرہ پر مامور کیا وہ طلبہ کو پڑھاتے تھے اور میں نگراں تھا اور فرصت کے وقت خود بھی درس دیتا تھا۔ طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی اندازہ ہوا کہ اگر اس مکتب میں اساتذہ کا اضافہ کر دیا جائے اور انگریزی شامل کر دی جائے تو یہ مکتب اسکول کی شکل اختیار کر سکتا ہے لہٰذا آخر فروری ۱۹۲۶ء پانچ برادران اسلام سے قیامِ اسلامی پنچائت کے لیے محکمہ فوجداری میں درخواست پیش کرائی جس کا مقصد حسب ذیل

قرار دیا گیا۔

۱۔ مسلمانوں میں ترقی تعلیم کی کوشش۔ ۲۔ مسلمانوں کی اصلاح و رسوم۔

مارچ ۱۹۲۶ء میں محکمۂ خاص سے منظوری آگئی۔ فراہمی روپیہ کے لئے مٹھی مٹھی آٹا، چوکھٹی رام چندر جی اور گھاٹ دروازہ سے مانگا گیا ......

میرے والد مولوی حافظ محمد معز الدین خاں صاحب پنشنر نائب بخشی خانہ فوج نے پانچ صد روپیہ نقد (جو اس وقت بہت بڑا عطیہ تھا) اجرائے اسکول کے لئے عطا کئے اور دیگر اصحاب نے بھی مالی امداد فرمائی۔

عرس اجمیر شریف میں کفشش برداری کر کے اچھی رقم لے آتے تھے[۱]

منشی امیر الدین خاں اور اُن کے رفقاء کی کوششیں رنگ لائیں اور قیام پاکستان کے وقت مسلم اسکول راجپوتانے کے مسلمانوں کی ایک ممتاز درسگاہ بن چکا تھا اور اس کا فیض آج بھی جاری ہے جناب الطاف احمد خیری جو مسلم اسکول کی انتظامیہ کے صدر کے عہدہ پر رہ چکے ہیں لکھتے ہیں:

یہ جے پور کا مسلم اسکول ہے۔ اتنی وسیع اور شاندار لاکھوں روپے کی عمارتیں۔ بڑے بڑے کلاس روم۔ لمبا چوڑا ہال، خوبصورت فرنیچر سے آراستہ ہے۔ کتب خانہ اور لیبارٹری وغیرہ کے لئے محفوظ قطعات کھیلوں کے لئے بڑا میدان اور بڑی سڑک کی طرف شاپنگ سینٹر۔ ڈیڑھ ہزار سے زیادہ طلبہ ہیں

منشی امیر الدین خاں نے مسلمانوں میں علم کی روشنی پھیلانے کا کام صرف جے پور تک محدود نہیں رکھا بلکہ مضافات میں بھی اُسی جوش و خروش کے ساتھ مسلسل جد و جہد کی اور انھوں نے جے پور میں ایک مسلم بورڈنگ ہاؤس بھی قائم کیا جس سے مسلم طلبہ کو سکون کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے مواقع حاصل ہو گئے۔

منشی امیر الدین خاں اردو زبان کے زبردست حامی اور مناد تھے چنانچہ انجمن ترقی اردو کی تحریک پر آپ نے راجستھان میں اردو کا تفصیلی جائزہ لیا اور اُن سازشوں کی نشاندہی کی جن کے ذریعہ مختلف ریاستوں سے اردو کا رواج اٹھنا شروع ہوا۔ ۱۹۰۸ء میں اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد بہ مقام اجمیر بصدارت سر شاہ سلیمان صاحب مرحوم منعقد ہوا۔ منشی صاحب نے اپنی تفصیلی رپورٹ اس اجلاس میں پیش کی جو پھر وہ علیحدہ سے بھی شائع ہوئی۔

نواب بہادر یار جنگ کے خطوط

نواب بہادر یار جنگ کے منشی امیر الدین خاں کے نام تحریر کردہ خطوط جیسا کہ ہم ابتدائی سطور میں عرض کر چکے ہیں اس زمانے

---

[۱] و [۲] بحوالہ مجموعہ کلام مولوی امیر الدین خاں "خیر الامانی" مقدمہ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔ صفحات ۱۷ — ۱۸۔

کی ریاست جے پور کی سیاست اور مسلمانوں کی تعلیمی کیفیات کے غماز ہیں ان خطوط کا پس منظر خاصا عجیب ہے۔ ان کے مطالعہ سے دو مخلص قومی رہنماؤں کے افکار و خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ اختلاف رائے کے باوصف وہ ایک دوسرے کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ عملی تعاون کے ساتھ جد و جہد بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ نواب بہادر یار جنگ نے مسلمانان جے پور کے مجموعی مفاد کے پیش نظر ریاستی مسلم لیگ کا دائرہ کار ریاست جے پور تک بڑھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس معاملہ میں ابتدائی ادوار میں ریاست جے پور کے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان عبدالصمد خاں راجستھانی نے خاص کام کیا لیکن عبدالصمد صاحب اور نواب صاحب میں اگرچہ خوردی بزرگی کا رشتہ تھا لیکن گرم خون غالباً نواب صاحب کی بھرپور قیادت قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ منشی امیرالدین خاں اس زمانہ میں بڑی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک طرف تو وہ ریاستی ماحول سے باہر مجموعی مسلم مفاد کا درد اور تڑپ رکھنے والے بزرگ تھے نیز اُن کو ذاتی طور پر نواب بہادر یار جنگ کے کام اور ذات سے بڑی عقیدت محبت تھی۔ دوسری طرف سر مرزا اسمٰعیل جیسے موقع پرست، ہندو نواز وزیر اعظم جے پور سے مسلمانوں کے واحد ادارے مسلم اسکول کے لئے امداد حاصل کرنی تھی جہاں تک مرزا اسمٰعیل کا تعلق ہے وہ نواب صاحب کے پرانے مخالف تھے۔ ریاستی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے نواب صاحب کی سرگرمیاں، سر مرزا اور اُن کے آقاؤں کی آنکھوں میں بری طرح کھٹکتی تھیں لہذا سر مرزا ہندو راجاؤں کی خاطر، نواب صاحب کے خلاف کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ جے پور کے مسلمانوں کا واسطہ سر مرزا سے کام لینا اور مسلم مڈل اسکول کو ہائی اسکول کے درجہ پر لانے کا حکم حاصل کر لینا کھلی ہوئی بات ہے کہ اس غرض سے اُن کو سر مرزا کے پاس آنا جانا بھی پڑا ہوگا۔ حاسدین نے ان ملاقاتوں کو مختلف رنگ دیکر نواب صاحب تک پہنچایا جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ سر مرزا اسمٰعیل نواب بہادر یار جنگ کے پہلے ہی سے مخالف تھے اور اُن کو ہونا بھی چاہیے کیونکہ نواب صاحب کی آفتاد مزاج اور سر مرزا اسمٰعیل کے محدود اور خود غرضی پر مبنی نقطہ نگاہ میں بُعد المشرقین تھا۔ ریاستی مسلم لیگ کی سطح پر نواب صاحب کی سرگرمیاں، سر مرزا کی نگاہ میں اس واسطے بھی کھٹکتی تھیں کیونکہ اُن کے انگریز اور اُن کے حاشیہ بردار ہنود کے مقاصد کے خلاف تھیں جہاں تک خصوصی منشی امیرالدین خاں، نواب صاحب اور جے پور کے مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی حالات کا تعلق ہے دونوں بزرگوں کا دامن خلوص نیت کی نعمت سے مالا مال تھا۔ اس ضمن میں راقم السطور نے منشی امیرالدین خاں کے حقیقی چھوٹے بھائی پروفیسر حامی الدین خاں سے جو کئی کتابوں کے مترجم اور عالمانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ استفسار کیا۔ آپ نے بھی میرے تجزیہ کی تصدیق فرمائی۔

ہم ابھی ابھی عبدالصمد خاں راجستھانی اور نواب صاحب کے اختلاف کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس اختلاف کا اصل سبب خود نواب صاحب کی زبانی اُن کے خط مورخہ ۵ دسمبر ۴۱ء کے حوالے سے ملاحظہ کیجیے!

"آپ نے میرے علم اور اجازت کے بغیر میری طرف سے خطوط لکھے اور میرے علم و اطلاع کے بغیر

میری طرف سے بیانات شائع کئے۔ میری طرف سے خطوط لکھے اور میرے علم و اطلاع کے بغیر اس پر میرے دستخط کئے۔ یہ باتیں ایک شخص کی انتہائی خفگی کے لئے کافی تھیں لیکن محض آپ کے جوش عمل کو دیکھ کر میں نے ہم اُن کو برداشت کیا،

آپ جانتے ہیں کہ ہم ... ... کو آپ سے خلوص اور محبت ہے۔ ہمارے اخلاص کو مجروح نہ کیجئے۔ اب مسئلہ زیادہ نہ الجھایئے۔

۱۶ر مارچ ۱۹۴۲ء کے والانامے میں نواب صاحب لکھتے ہیں۔

"میں بہ حیثیت صدر آپ سے جواب طلب کرتا ہوں کہ جن خیالات کو مجلس عاملہ (اسٹیٹس مسلم لیگ) نے مسترد کر دیا اس کو آپ نے بہ حیثیت سکریٹری کیوں شائع فرمایا۔ اور کیوں نہ آپ کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔"

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے خطوط کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منشی امیرالدین خاں، جے پور کی حالات و واقعات سے نواب صاحب کو مطلع کرتے رہتے تھے نیز دیگر ذرائع سے بھی وہ باخبر رہتے تھے۔ نواب صاحب اپنے خط مورخہ ۲۵ر نومبر ۱۹۴۲ء میں رقمطراز ہیں!

"آپ کی فراہم کردہ معلومات نے ریاست جے پور کے تمام حالات کا انکشاف کر دیا۔"

۲۳ر مارچ ۱۹۴۲ء کے خط میں ریاست جے پور کی پالیسیوں کے بارے میں نواب صاحب لکھتے ہیں!

"جے پور کی بعض عدالتوں اور دفاتر میں اردو زبان میں لکھے ہوئے کاغذات کے قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اس کو جے پور کی حکومت تسلیم نہیں کرتی ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس کی نسبت کوئی نظیر پیش کریں۔

میں نے آپ حضرات سے بار بار دریافت کیا تھا اور آپ نے اصراراً کہا تھا کہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔ براہ کرم ایسے واقعات کی مثالیں تحریر فرمایئے تاکہ میں آپ کے وزیر اعظم کو مطمئن کر سکوں۔"

۱۰ر فروری ۴۴ء کا والانامہ بڑے دلنشیں انداز میں لکھا گیا ہے۔ ضروری اقتباسات ملاحظہ فرمایئے!

"جے پور کے حالات مختلف ذرائع سے معلوم ہو رہے ہیں اور میں پریشان ہوں کہ ان پر کس طرح یقین کروں۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ سے مرزا صاحب کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے ہیں اور انہوں نے مسلم مڈل اسکول کو ہائی اسکول بنانے کا وعدہ کر لیا ہے لیکن یہ وعدہ تو غالباً گذشتہ سال میری آمد کے موقع پر بھی ہوا تھا،

اپنی جن کمزوریوں پر ناز کرتا ہوں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ جن سے محبت کرنے لگتا ہوں اُن پر شبہ کرنے کو مشکل سے آمادہ ہوتا ہوں۔ جب آپ کے خلاف اطلاعات نے کان بھرے کر دیئے

اور بعض غیر جانبدار ذرائع سے بھی، یہی خبریں سنیں تو مناسب سمجھا کہ خود آپ سے دریافت کروں۔ کیئے اصلاحات کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے۔ مرزا صاحب کے کیا رنگ ہیں آپ کے خیال میں اب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے۔

منشی امیر الدین خاں صاحب کے خطوط ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں تاہم نواب صاحب کے مراسلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ منشی صاحب نے اپنے خطوط میں حتی الامکان صورت حال واضح کرنے کی کوششیں کی ہونگی جیسا کہ ۱۷ر مارچ ۴۴ء کے خط سے مترشح ہوتا ہے۔

"مسلم مڈل اسکول کے متعلق حکومت کی پالیسی اور ہائی اسکول بن جانے کی توقع سن کر دلی مسرت ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی جو کامیابیاں مسلمانوں کے اجتماعی مفاد میں آپ کو ہوئیں اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔"

میں قطعاً یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان خواہ مخواہ اور جا و بیجا حکومت سے برسر پیکار رہیں خصوصاً ہندو ریاستوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں میری دلی تمنا ہے کہ اپنے جائز حقوق کے تحفظ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات حکومت کے ساتھ اچھے رہیں۔ بحث صرف وہیں پیدا ہوتی ہے جہاں تعلقات رکھنے کی تمنا ہو اور مفاد ملت نظر انداز کر دیا جائے۔ آپ نے یہ لکھا ہے کہ یہ کامیابیاں میرے کلمات خیر ہونے کی وجہ سے ہوئیں۔ ان کو باور کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ میری باوثوق اطلاعیں تو یہ ہیں کہ سر مرزا اسمٰعیل مجھ سے بہت ناراض ہیں اور انھوں نے اس ناراضی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور میری ... بہ ظاہر پریشانیوں میں ان کے فکر و عمل کی بھی شرکت ہے۔ دہلی میں ایک مرتبہ انھوں نے علیا شہزادی ... سے بھی ناراضی کا اظہار کیا اور میری جارحیت کی شکایت کی۔ برسوں ہوئے کہ میرا دل کسی کی تعریف یا شکایات سنکر متاثر ہونے کی عادت چھوڑ چکا ہے۔ یہ تھا جملۂ معترضہ جس کو آپ بھی بھلا دیں۔"

نواب صاحب اور منشی امیر الدین خاں مرحوم میں خاص روابط رہے دونوں ملت اسلامیہ کی خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے نواب صاحب ملک گیر انداز پر قیادت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور منشی امیر الدین خاں مقامی طور پر ریاست جے پور میں وہی کام کر رہے تھے۔

جب نواب بہادر یار جنگ دو مرتبہ جے پور میں تشریف لائے تو ان کے سب سے بڑے استقبال کرنے والے اور ان کے معتمد منشی امیر الدین خاں تھے۔ نواب صاحب کو جے پور سے ایک خاص تعلق خاطر تھا کہ ان کے بزرگ جے پور کے قصبہ "دائرہ" سے نقل مکانی کر کے حیدر آباد دکن تشریف لے گئے تھے اور وہاں اعزاز و مناصب پر فائز ہوئے چنانچہ منشی امیر الدین خاں نے نواب بہادر یار جنگ مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے مندرجہ ذیل قطعہ کہا ہے۔

قطعہ

یک نقطہ منوّر بر کار عسرشیاں — ازدائرہ[1] بلند شد و آفتاب شد
طالع نداشت ذرّہ جے پور تا دہد — شکر خدا ز سایۂ تو کامیاب شد

منشی امیرالدین خاں قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے یہاں آگئے تھے اور حیدرآباد میں قیام کیا۔ آخر وقت تک تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۲ ؍اگست ۱۹۷۰ء کو پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور انھوں نے عالم جاودانی کی راہ لی۔

مجسمۂ ایثار و عمل

علامہ اقبال، مولانا شوکت علی اور حاجی سر عبداللہ ہارون کی دائمی مفارقت کے بعد ہمارے آنسو خشک نہ ہونے پائے تھے کہ ایک دن صبح "گڑھی حبیب اللہ" میں جہاں ہمارا کیمپ تھا، یہ وحشت ناک اور دل خراش خبر ملی کہ یکایک نواب بہادر یار جنگ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ دل پاش پاش ہو گیا۔ اس سانحۂ عظیم کو باور کرنا بعید از قیاس تھا۔ موت اور ظالم و بے درد موت نے دستِ تظلم اس قوم کے ایک جواں سال مجسمۂ ایثار و عمل اور پیکرِ خلوص قائد پر دراز کیا جو تنظیم کی ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہے لیکن اس نے خدائے لایزال کے اس حکم کو دہرایا کہ —— کل من علیہا فان

ہندوستان کے مسلمان سوچ رہے تھے کہ مولانا شوکت علی کی خالی جگہ کو کون پُر کر سکے گا۔ بہادر یار جنگ نے اس کمی کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ پورا کیا۔ مرحوم میں دو خوبیاں ایسی جمع ہو گئی تھیں جو شاذ و نادر ہی کسی لیڈر میں پائی جاتی ہیں۔ آپ قدامت پسند اور جدت پسند مسلمانوں کے یکساں رہبر تھے قائدِ اعظم کے خطبات، صدارت کو آپ بہترین مذہبی رنگ میں سحر آفریں تقریروں کے ذریعہ عوام تک پہنچاتے تھے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت تسلیم کرانے میں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ ۱۹۳۸ء میں اکابر قوم سے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ پٹنہ میں ایک عصرانہ میں متعارف کرائے گئے۔ اس وقت تک آپ کی فصاحت و بلاغت کی شہرت ملک حیدرآباد کی حد تک محدود تھی۔

(نواب صدیق علی خاں)

---

[1] مرحوم نواب کا وطن قصبہ دائرہ علاقہ جے پور ہے۔

نظریۂ پاکستان کے عظیم مبلغ

نواب بہادر یار جنگ

از پروفیسر محمد خلیل اللہ پرنسپل وفاقی گورنمنٹ اردو کالج

شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی

تحریر:۔ محمد صادق قصوری

نواب بہادر یار جنگ رح

"اگر ہندوستان نے دوسرا محمد علی جوہر پیدا کیا ہوتا تو وہ نواب بہادر یار جنگ کے سوا اور کوئی نہ ہوتا۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، وہی خلوص، وہی مذہبی جوش، وہی بے پناہ جذبۂ خدمت، وہی دور اندیشی، وہی قوتِ برداشت، وہی سوجھ بوجھ اور وہی شرافت"۔

یہ ہیں وہ الفاظ جو مولانا عبد الماجد دریابادی نے قائد ملت لسان الامت نواب بہادر یار جنگ کے بارے میں کہے تھے۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نواب بہادر یار جنگ نے سارے ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں ایسی ہی طمانیت پیدا کر دی تھی۔ ان لوگوں نے یا تو بہادر یار جنگ کی تقریریں سنی تھیں یا اخبارات اور رسائل میں ان کے مضمون پڑھے تھے۔ ان کے فکر و عمل کی بنیادیں حب وطن اور عالم اسلام کی خدمت کے جذبے پر قائم تھیں۔ اس معاملے میں وہ کسی مفاہمت کے قائل نہ تھے اور نہ کسی اثر اور دباؤ کو قبول کرتے تھے۔ اس راستے میں وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے مستعد رہتے۔ انھوں نے کبھی اپنے ذاتی مفاد کو اپنے عوام کے مفاد پر ترجیح نہ دی۔ وہ اس راستے میں کسی کٹھن سے کٹھن آزمائش سے بھی پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ وہ اسلام کے ایک جانباز سپاہی تھے اور اس میدان میں ان کے کارنامے اُس ہیرے کی طرح ہیں جس کے کئی پہلو ہوں اور ہر پہلو ایک نئی آب و تاب دکھاتا ہو۔ [1]

محمد بہادر خان الملقب بہ نواب بہادر یار جنگ کی ولادت باسعادت ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۳ فروری ۱۹۰۵ء کو حیدر آباد دکن میں نواب نصیب یاور جنگ کے ہاں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ اور مفید الانام میں ہوئی۔ پھر مدرسہ دار العلوم میں داخل کئے گئے۔ ابھی میٹرک کا امتحان دینے نہ پائے تھے کہ والد گرامی کا انتقال ہو گیا۔ اور ہر قسم کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُن کے کندھوں پر پڑ گیا مگر انھوں نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ مولوی سعد اللہ خاں مندوزئی اور مولوی سید اشرف شمسی (صاحب تفسیر شمسی) سے عربی ادب، تفسیر، حدیث اور فقہ کی بنیادی تعلیم حاصل کی۔ پھر آگے جو کچھ ہوئے وہ اُن کی ذاتی کاوش، ذہانت، وسعتِ مطالعہ کا رہین منت تھا۔ خود فرماتے تھے کہ میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں تک کسی سے سبقاً سبقاً نہیں پڑھیں، صرف عربی ہی کی تعلیم پائی۔ مگر ۲۵ برس کی عمر میں قرآن حکیم کے ایک غامض نظر طالبعلم اور تاریخ اسلام کی اتھارٹی بن چکے تھے، اور اُردو زبان تو ان کی تھی ہی۔ عربی، فارسی اور انگریزی پر بھی استفادہ کتب اور اظہار مدعا کا پورا قابو رکھتے تھے۔ [2]

نواب صاحب کو اس دنیا میں آنکھ کھولے ہوئے ہفتہ بھر بھی نہ ہوا تھا کہ اُن کی والدہ چل بسیں، اور یہ اپنی نانی کے زیر

---

[1] ماہ۔ یاران مشاہیر کی نظر میں مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء ص ۳۷۔ [2] حیات بہادر یار جنگ از غلام محمد، کراچی ۱۹۰۷ء ص ۲۰۔

بیت آئے۔ مرحومہ ایک دیندار اور خداترس خاتون تھیں، قومی معاملات سے بھی دلچسپی رکھتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ اخبار بڑی پابندی سے پڑھا کرتی تھیں۔ تقریباً چودہ برس تک قائد ملت مرحوم انہی کے زیرِ تربیت رہے۔

نانی نے نواسہ پر مذہبی رنگ چڑھانے کی پوری پوری کوشش کی اور کامیاب رہیں۔ بچپن ہی سے ادائی نماز اور تلاوت قرآن پاک کی بہت پابندی کرائی۔ چنانچہ نواب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس روز صبح میں تلاوت نہ کرتا اُس روز وہ مجھ سے قطع کلام فرماتیں، یہ کہتے ہوئے کہ "آج تم نے اللہ سے باتیں نہیں کی ہیں۔ میں تم سے بات نہ کروں گی۔"

درسی تعلیم سے ہٹ کر قائد ملت نواب بہادر یار جنگ نے فنونِ سپہ گری میں مہارت تامہ حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ مدینہ شریف حاضر ہو کر حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ بیکس پناہ میں عقیدت و محبت کے پھول پیش کئے۔ ابھی آپ مدینہ شریف سے باہر ہی تھے کہ مسجد نبویؐ اور گنبد خضریٰ پر نظر پڑی۔ آنکھوں سے بے اختیار سیلِ اشک رواں ہو گیا اور زبان سے بے ساختہ السلام علیک یا رسول اللہؐ کے نعرے نکلنے لگے۔ جنت البقیع کی بھی زیارت کی، مزارات کی شکستہ حالی سے بہت دلگیر ہوئے، اسی روز شام کو نہر زرقاء اور اطرافِ مدینہ کے باغات کی سیر کی۔

نواب صاحب نے حضرت مولانا عبدالباقی فرنگی محلی مہاجر مدنیؒ سے بھی ملاقات کی جو قیام الدین مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے استاد اور قرابت دار تھے اور چالیس برس سے مدینۃ الرسولؐ میں مقیم تھے۔ اس کے بعد آپ نے بیروت، فلسطین، مصر، شام، ترکی، عراق، ایران اور افغانستان کی سیاحت کی اور مزاراتِ مقدسہ پر حاضری کا شرف حاصل کیا۔

۱۹۲۶ء میں آپ نے مجلسِ انجمن تبلیغِ اسلام کی بنیاد ڈالی اور مسلسل تین سال تک حیدرآباد کے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں گھوم کر تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیا۔ اگرچہ انھیں اپنوں اور بیگانوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

۱۳۴۷ھ میں حیدرآباد میں مجلسِ اتحاد المسلمین معرضِ وجود میں آئی تو نواب صاحب نے اس میں شامل ہو کر پوری سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ آپ کا مجلس میں آنا تھا کہ وہ عوام میں متعارف ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر مسلمان کے دل کی دھڑکن بن گئی۔ ۱۹۳۹ء میں نواب صاحب پہلی بار مجلس اتحاد المسلمین کے صدر منتخب ہوئے اور پھر تادمِ واپسیں مسلمانانِ حیدرآباد کے غیر متزلزل اعتماد کی وجہ سے اس منصب پر فائز رہے۔ [2]

نواب بہادر یار جنگ نے تحریک پاکستان میں عدیم النظیر کردار ادا کیا۔ آپ نے مسلم لیگ کی تبلیغ و ترویج اور اُس کو مستحکم بنانے کے لئے شب و روز کام کیا۔ آپ کی خدماتِ جلیلہ سے متاثر ہو کر حضرت قائد اعظمؒ آپ پر جان چھڑکتے تھے اور آپ بھی قائد اعظمؒ کے تدبر و فکر کی وجہ سے اُن کے گرویدہ تھے۔ حیاتِ بہادر یار جنگ کے مصنف غلام محمد اس سلسلے میں مسلم لیگ اور قائد اعظم کے عنوان سے یوں رقمطراز ہیں:-

---

۱ حیاتِ بہادر یار جنگ ص ۱۲ تا ۵۶ ۲ ایضاً ص ۸۹

قائد اعظم

مثل مشہور ہے، "جوہر کی قدر جوہری جانے" بڑی ہستیوں کے بڑے کاموں کے سمجھنے کے لئے ایک اعلیٰ دماغ کی ضرورت ہے ــــ مرحوم کی نگاہ میں نہ صرف ہندوستان کے مسلمان اور ان کے مختلف رہنما تھے، بلکہ کل بلادِ اسلامیہ کے مسلمان اور ان کے لیڈروں کی حالت و استعداد تھی ــــ مرحوم کی نگاہوں نے ہندی مسلمانوں کے لئے قائد اعظم محمد علی جناح سے زیادہ بے لوث، بے ریا، پر خلوص اور ماہر فن قائد کسی کو نہ پایا۔ مسٹر جناح کی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں اور ان کے تدبر و تفکر نے نواب صاحب کا دل موہ لیا ــــ مرحوم کا خیال تھا، (اور کس کو اس سے انکار کی مجال ہے) کہ قائد اعظم سے بڑھ کر گاندھی کے بدلتے ہوئے پینتروں کو سمجھنے والا، حکومت برطانیہ کی چال بازیوں اور مکر سامانیوں کو تاڑ لینے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا ــــ میں نے دیکھا ہے اور جن لوگوں نے بھی قائد ملت کو قائد اعظم سے ملتے دیکھا ہوگا وہ اس بات کی تصدیق کریں گے، کہ قائد اعظم کو دیکھتے ہی مرحوم کی رگ رگ میں فرحت انبساط کی ایک لہر دوڑ جاتی، اور چہرہ جو قلب و دماغ کا سب سے بڑا آئینہ ہوتا ہے، یکایک دمک اٹھتا تھا ــــ نواب صاحب قائد اعظم سے اس طرح ملتے تھے جیسے کہ ایک معمولی رضاکار، اپنے سپہ سالار سے ملے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ قائد اعظم کا اتنا پر خلوص قابلِ اعتماد اور جانباز سپاہی کوئی اور نہ تھا ــــ وہ قائد اعظم جن کی زبان اپنے ساتھیوں اور ملت کے خادموں کی تعریف میں کبھی نہیں کھلتی تھی، بہادر یار جنگ کی تعریف و تحسین میں یوں در افشاں ہوتی ہے :-

"اعلیٰ حضرت حضور نظام کی رعایا کی حیثیت سے اگرچہ نواب بہادر یار جنگ کا کوئی دستوری تعلق مسلم لیگ سے نہیں، لیکن بڑے بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لئے معین اور رہبر ثابت ہوئے ہیں، نواب صاحب نے مسلمانانِ حیدر آباد کی تنظیم میں اپنی جس قابلیت کا ثبوت دیا ہے وہ ہم سب کے لئے باعثِ فخر و مسرت ہے ــــ خدا انھیں عمر دراز عطا فرمائے۔ آمین ــــ"

یہ اظہار حقیقت تو ان کی حیات میں ہوا، جب رحلت فرما گئے تو قائد اعظم دفورِ غم سے بیخود ہو گئے، جب سنبھلے تو فرمایا:

"وہ ایک مسلمان تھے قلب و روح کی مسلمانی کے ساتھ۔"

اور یہ بھی سنا ہے کہ جب لیگ کی مجلس عاملہ میں قرار دادِ تعزیت پیش ہو رہی تھی تو قائد اعظم کے ضبط کا جام پُر ہو چکا تھا، اور حسرت آمیز محبت کی شراب ساغرِ چشم سے چھلک چھلک جا رہی تھی ــــ قائد اعظم کی یہ کیفیت عمر میں صرف دو بار دیکھی گئی ــــ ایک بار مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر، دوسرے اس مردِ مومن کی رحلت پر۔

بہادر یار جنگ کو بھی مسٹر جناح کی ذات سے ایسی ہی عقیدت و محبت تھی، ــــ رات کے بارہ بجے ہیں، نواب صاحب اپنے کام میں مصروف ہیں، (کیونکہ بارہ ایک بجے سے قبل سونے کی مہلت کہاں ملتی تھی) مجلس اتحاد المسلمین کے ایک پُر خلوص کارکن مولوی حبیب محمد خاں صاحب بھی موجود ہیں، یونائیٹڈ پریس سے ایک تہلکہ انگیز خبر آئی، معلوم ہوا کہ کسی بدنیت نے قائد اعظم پر قاتلانہ حملہ کیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ جناح بچ گئے ــــ یہ خبر پڑھتے ہی دل و دماغ پر رنج و غصہ اور ساتھ ہی شکر و امتنان کی متضاد کیفیات چھا گئیں، جب گھنٹہ بھر برس کر مطلع کچھ چھٹ گیا تو فرمانے لگے :-

"خاں صاحب! آپ کیا جانیں قائد اعظم کو، ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیا ہیں ــــ اگر آج خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو ملتِ اسلامیہ ہند کی کشتی کو سنبھالنے والا تھا بھی کوئی اور ؟"

اس کے بعد پھر رونے لگے ـــــ رات اسی طرح کٹی، صبح ہوئی تو پہلی ٹرین سے بمبئی چل پڑے ـــــ یہ تھا محبت کا عالم!

کتنی دفعہ نواب صاحب نے اپنے ملنے جلنے والوں کے سامنے اس امر کا اظہار کیا کہ :-

" اگر میری دعا قبول ہوتی تو میں التجا کرتا کہ اے اللہ! تو میری عمر کو گھٹا کر قائد اعظم کو عمر طویل عطا فرما۔"

اس محبت کے باوجود اعتدالِ فکر و مزاج کی بنا پر نواب صاحب فرماتے تھے کہ "مسٹر جناح پلیٹ فارم کے لیڈر ہیں، میدانِ عمل میں اتر آنا اُن کے لیے ممکن نہیں، اُن کا اسی مقام پر رہ کر کام کرنا زیادہ اولیٰ ہے اور اسی طرح وہ ملت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔"

نواب صاحب کا ایقان تھا کہ اس وقت کے حالات کے تحت قائد اعظم ہی ہندی مسلمانوں کے قائد ہو سکتے ہیں، وہ چاہتے تھے کہ مختلف صلاحیتوں کے لوگ لیگ کی مرکزیت کے تحت اپنے اپنے اصلاحی امور انجام دیں۔

ـــــ قائد اعظم پر سب سے بڑا حملہ اُن کے مغرب زدہ ظاہر پر کیا جاتا تھا، اس کے جواب میں نواب صاحب نے راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے (جب کہ وہ کشمیر سے نکالے گئے تھے) ـــــ پہلے مسٹر جناح کی قابلیت اور قائدانہ صلاحیتوں کو بہت سراہا، پھر فرمایا :-

" مجھے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں فرمایا گیا کہ مسلمانوں پر ایک وقت آئے گا جبکہ فاسق و فاجر اٹھ کر اُن کی رہنمائی کریں گے، میں جناح کو اچھی طرح جانتا ہوں، کیونکہ مجھے اُن کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملا ہے وہ افرنگ زدہ مغربیت میں رنگے ہوئے ہیں، مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اِنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ کی صداقت پر اب پورا یقین ہو گا اور اس وقت مسلمانوں کی حالت اس کی پوری طرح تائید کر رہی ہے۔" (مدینہ ۵ ستمبر ۱۹۴۳ء)

مسلم لیگ سے تعلق

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ نے اللہ کی بے پناہ عنایتوں اور بخششوں کو بے دریغ لٹایا، دولت لٹائی، راحت و آرام نثار کیا، جسمانی قوتیں صرف کر دیں، دماغی صلاحتیں وقف کر دیں۔ تڑپتے رہے تڑپاتے رہے، جہاں سردی پائی حرارت کی لہر دوڑا دی، جہاں چنگاریاں نظر آئیں اُن کو بھڑکا دیا، بس جلنا جلانا ہی اُن کا مقصدِ زندگی تھا، یہ مشرب کسی کو محدود و مقید کیسے رکھ سکتا ہے؟ ہر تحدید جذبۂ خدمت کے سیلاب سے مٹتی گئی ـــــ صدر مجلس اتحاد المسلمین دیکھتے ہی دیکھتے صدر آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ اور پھر خود آل انڈیا مسلم لیگ کے قائدین میں سے سمجھا جانے لگا، بلا کی کشش اور غضب کی جاذبیت تھی، تقریر ہی نہیں خود ذات میں عمل میں، فہم میں تدبر میں اور مخالفوں کو اپنانے میں، جو ایک دفعہ اُن سے قریب ہوتا وہ اُن سے چمٹ جاتا، اُن پر فریفتہ ہو جاتا۔

مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر آتے ہی نواب صاحب کا وہ رنگ جما کہ اوروں کا رنگ مدھم پڑ گیا، اپنے اس اثر سے انھوں نے قائد اعظم کے بڑے بڑے کام انجام دیئے ـــــ سرحد میں سرحدی گاندھی (عبدالغفار خاں) کا سحر کس نے توڑا؟ جنوب میں راس کماری تک مسلم لیگ کا ڈنکا کس نے بجایا؟ لاہور کا وہ تاریخی جلسہ جس میں تحریک پاکستان پیش ہوئی کس کی وجہ سے ہو سکا ہے ـــــ خاکساروں کی شورش سے حکومت نے مسلمانوں کے اجتماع کی ممانعت کر دی تھی مسلم لیگ

کے سالانہ جلسے کے تمام انتظامات ہو چکے تھے اور قائدِ اعظم، دہلی پہنچ چکے تھے، لیکن یکایک اس امتناعی حکم کی وجہ سے سالے عزائم ملیامیٹ ہوئے جا رہے تھے، ایسے وقت میں بہادر یار جنگ نے قائدِ اعظم کو یقین دلایا کہ جلسہ ہو کر رہے گا اور ڈسپلن (نظم و ضبط) کا ذمہ دار میں ہوں! آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے حکومت پر اس امر کا اظہار فرما دیجئے کہ وہ جلسہ کی اجازت دے دے، نظم و ضبط اور امن و سکون کا ذمہ دار میں (یعنی قائدِ اعظم) ہوں۔ قائدِ اعظم نے اپنے پُرخلوص اور حوصلہ مند ساتھی پر کامل اعتماد کرتے ہوئے اور اس کی قوتِ بازو کو محسوس کرتے ہوئے حکومت سے اپنی ذاتی ضمانت پر جلسہ کے انعقاد کا مطالبہ کیا، حکومت نے منظور کر لیا۔ مسلم لیگ کا صدر اور دیگر عہدیدار لاہور پہنچے، قائدِ ملت نے خاکساروں میں دو تین ایسی اثر آفرین اور بصیرت افروز تقریریں کیں کہ آن کا بے جا جوش سب ٹھنڈا ہو گیا، اور جس شان و شوکت اور امن و سکون کے ساتھ لیگ کا یہ تاریخی اجلاس اختتام کو پہنچا وہ اظہر من الشمس تھا۔

آپ نے اس اجلاس کی آخری نشست سے خطاب فرماتے ہوئے واقعات اور تاریخ کی روشنی میں ان حقائق کی پوری وضاحت کے ساتھ نشاندہی کی تھی کہ اسلامیانِ ہند نے تقسیمِ ملک کی قرارداد کو کیوں اور کس لئے پیش کیا ہے، آپ کی تقریر کے دوران کامل سکوت تھا اور آپ تمام مجمع پر چھائے ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں آپ کی تقریر نے ایسا جادو کیا کہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہو گئی۔ آپ کی اس تقریر کے بعد قائدِ اعظم کھڑے ہوئے اور فرمایا:۔

"بہادر یار جنگ کی تقریر کے بعد کسی اور شخص کا کچھ بولنا بہت بڑی غلطی ہے"

اور فوراً ہی اجلاس برخاست کر دیا۔ [1]

علاوہ ازیں لیگ کے عہدہ داروں و عوام میں ذہنی انقلاب کس نے پیدا کیا؟ مذہب کی وقعت و عظمت کا سکہ دلوں پر کس نے بٹھایا؟ قرآن اور سیرتِ طیبہ کے مطالعہ کا ذوق کس نے پیدا کیا؟ کراچی (دسمبر ۱۹۴۳ء) کے یادگار سالانہ جلسہ میں کس کی زبان حقیقت ترجمان یہ سنا رہی تھی اور جتا رہی تھی کہ:۔

"سُن لو اور آگاہ ہو جاؤ کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر نہیں ہے وہ شیطانی سیاست ہے ——— میرے دوست جسمانی ناپاکی دور ہو سکتی ہے لیکن ذہن و فکر اور قول و فعل کی ناپاکی وہ گندگی ہے جس کو دھونے کے لئے خدا نے انبیاء جیسی ہستیاں پیدا کی تھیں، کیا ان ناپاکیوں کا مرکز بن کر، جھوٹ کو اپنا روز مرہ کا شعار بنا کر، خود غرضی میں مبتلا رہ کر، ظلم و استبداد کو جاری رکھ کر، ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہم پاک ہیں؟ اور اگر ہم ان گندگیوں سے پاک نہ ہوئے اور ہمیں ہندوستان کے دونوں شمالی گوشوں میں خود مختار حکومتیں مل بھی گئیں تو کیا وہ پاکستان کہلانے کی مستحق ہوں گی؟

پاک بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کرو اور یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے کے لئے پاک بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لئے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے، ——— مکر و زور کی سیاست، طالبانِ پاکستان کی سیاست نہیں ہو سکتی، آپ کی کونسل آف ایکشن کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہو گا کہ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں کو آج سے پاک کر دے گی۔ آہ! یہ ایک حقیقت ہے کہ سپاہی اس وقت تک پاک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایک سپہ سالار پاک نہ ہو۔ سُن لو اور یاد رکھو! اسلام کے عہدِ آخر کا سب سے بڑا مفکر کیا کہہ رہا ہے:۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو ——— کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

---

[1] نواب بہادر یار جنگ از سید احمد اللہ نصرت نوشاہی، لاہور ۱۹۷۱ء ص ۷۴۔ روزنامہ مشرق لاہور ۲۵ جون ۷۴ء۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی طبیعت میں بوئے اسد اللّٰہی

ور ڈائس پر بیٹھنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر :-

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی "

لیگ عوام اور نرے سیاسیوں کو مذہب کی بے خمار شراب کے جام پلا کر اور اُن کی محفلوں میں اس کے خم کے خم لنڈھا کر، ترکی کی راہ اختیار کرنیوالوں کو مکہ مدینہ کی طرف پھیر دینا کوئی چھوٹا احسان ہے ؟

نواب صاحب مرحوم، رعایا حیدر آباد سے ہونے کے سبب، لیگ کے رکن نہ تھے، اور نہ جلسوں کے وقت اُس کی کارروائیوں میں حصہ لیتے تھے، لیکن لیگیوں میں غیر سرکاری طور پر شعور پیدا کرتے اور اُن میں عزم و یقین کو راسخ کرنے اور حصولِ پاکستان کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے کا ولولہ نواب صاحب ہی پیدا فرمایا کرتے تھے، اور سب کو تیار کر کے لیگ کے تاریخی جلسوں میں لاتے اور خود تماشائی بن کر پورے جلسہ کی کارروائی دیکھتے اور جب پوری کارروائی ختم ہو جاتی، اور قانونی حیثیت سے جلسہ برخاست ہو جاتا تو قائدِ اعظم کے حکم سے خود اجلاس عام کو مخاطب کرتے تھے ـــــ لیکن عوام کے لیے تو کارروائی کا اختتام ہی جلسہ کا آغاز ہوتا تھا۔ دو دو گھنٹے نہیں تین تین گھنٹے تقریر ہوتی اور مجمع میں سے کوئی شخص انگڑائی تک نہ لیتا، تاثیر کا وہ دریا بہتا کہ لوگ مرحوم کے قدموں میں آ کر بے جان بن جاتے ـــــ یہی وجہ تھی کہ جب مرحوم نے لیگ کی "دس لاکھ کی اپیل" کے سلسلے میں مسلمانوں کو جھنجھوڑنا شروع کیا تو ایک گھنٹے کے اندر الٰہ آباد کے سالانہ جلسہ میں ہزاروں روپیہ نقد، ہزاروں کے وعدے اور زیورات کا ڈھیر لگ گیا۔ یہی کیفیت کراچی کے جلسہ میں بھی دیکھی گئی ـــــ اسی طرح دہلی کے سالانہ جلسہ میں قائدِ اعظم نے نواب صاحب مرحوم سے فرمایا۔

"میرا خیال ہے کہ اس جلسہ کے اخراجات، جس کا تخمینہ ایک لاکھ ہے، اسی جلسہ سے پورے ہو جائیں، میں نے اپیل کی تھی لیکن اب تک صرف چند ہزار روپے جمع ہوئے ہیں" ـــــ

جلسہ کا آخری روز ہے، کارروائی ختم ہو چکی، برخاست کا اعلان ہو چکا، لوگ بجائے اُٹھنے کے سنبھل کر بیٹھے لگے، اشتیاق سے ڈائس کی طرف نظریں اٹھنے لگیں، کس کا انتظار ہے ؟ وہی قائدِ ملت کا ! ـ قائدِ اعظم نے اعلان کیا کہ "اب نواب صاحب تقریر کریں گے" یہ مسرت حیات کی ایک لہر دوڑ گئی ـــــ قائدِ اعظم پہلے ہی اشارہ کر چکے تھے، پاکستان کی اہمیت و افادیت پر تقریر ختم ہوئی اور نواب صاحب نے مسلمانوں کی عملی کمزوریوں کا شمار شروع کیا اور یہ فرمایا کہ جو "مال کا ایثار نہیں کر سکتے وہ جان کیا دے سکیں گے" یہ سننا تھا کہ روپوں اور چیزوں کی بارش ہونے لگی، قائدِ اعظم نے اعلان فرمایا کہ "میں صرف شکر گزار ہوں گا" ـــــ صبح حساب لگایا گیا تو سوا لاکھ رقم وصول ہو چکی تھی۔ [1]

صوبہ سرحد میں لیگ کی جانفروشانہ خدمت

صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی کامیابی نواب بہادر یار جنگ کی سرفروشانہ خدمت کی رہینِ منت ہے۔ سرحد میں مسلم لیگ کا اثر بہت کم تھا،

---

[1] ... بہادر یار جنگ

سردار اورنگ زیب خاں جو سرحد مسلم لیگ کے صدر تھے، محسوس کر رہے تھے کہ اگر ان کو بہادر یار جنگ کا عملی تعاون حاصل نہ ہوا تو صوبہ سرحد کے انتخابات میں لیگ کا جیت جانا محال ہے، انھوں نے قائد ملت کو اصرار سے اس کی دعوت دی، ادھر یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ قائد اعظم پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ اس سے بچ نکلے تو عیادتی تار سردار اورنگ زیب نے بھیجا دیا، اس کے جواب میں قائد اعظم نے لکھا کہ "میرے زخم تو اس وقت تک مندمل نہ ہوں گے جب تک سرحد میں مسلم لیگ کو فتح نہ ہوگی۔" اب سردار صاحب نے قائد ملت سے اور زیادہ تقاضہ کیا، خطوط اور تاروں کی بھرمار کردی کہ جلد سرحد تشریف لائیں، مرحوم نواب صاحب نے اس بارے میں جناح صاحب سے مشورہ کیا، جناح صاحب نے پہلے تو تائیدی جواب دیا مگر دوسرے خط کے ذریعے منع فرمایا کہ اس کی وجہ سے نواب صاحب کے اور اعلیٰحضرت نظام دکن کے باہمی تعلقات خراب نہ ہوجائیں۔ ے

مگر خود نواب صاحب سے بھی رہا نہ گیا، اور جناح صاحب کو راضی کرکے، اعلیٰحضرت کی ناراضی کا خیال کئے بغیر دورۂ سرحد پر روانہ ہوگئے۔

صوبہ سرحد میں قائد ملت کی ہمراہی میں سردار اورنگ زیب اور قاضی محمد عیسیٰ صدر بلوچستان مسلم لیگ نے دورہ شروع کیا، ——— سرحد میں فقیر ایپی کی ہولناک سرگرمیاں پوری دہشت انگیزی سے جاری تھیں، سرحد کی سڑکوں پر سفر کرنا موت کی راہ پر چلنے کے مترادف تھا، ایسی پُرخطر حالت میں تین عظیم لیگی موٹر پر چلے جا رہے تھے، قاضی عیسیٰ موٹر چلا رہے تھے، کوئی دشمن گولی چلاتا تو اس کا پہلا نشانہ قاضی عیسیٰ بنتے، شیر دل بہادر یار جنگ نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرکے قاضی عیسیٰ کے ہاتھ سے اسٹیرنگ لینے کی کوشش کی، قاضی صاحب، قائد ملت کی زندگی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز اور گرانقدر سمجھتے تھے، اس لئے وہ اسٹیرنگ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے، اور قائد ملت کا کہنا تھا کہ قاضی صاحب کی جان زیادہ قابل قدر ہے، غرض باہمی ایثار کی اس کشمکش میں قائد ملت غالب آگئے اور اب موٹر اللہ کے ایک بہادر سپاہی کے ہاتھ میں تھی، اور فراٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی کہ ایک شخص نے موٹر روکنے کا اشارہ کیا، موٹر رکی، وہ قریب آیا اور اس نے پوچھا "آپ میں بہادر یار جنگ کون ہے؟" قائد ملت نے اپنے سینہ کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "میں" ——— اس نے تنہائی میں چل کر بات کرنے کی خواہش کی اور بتایا کہ فقیر ایپی کا پیام سنانا ہے، ساتھیوں نے بہادر یار جنگ بے خطر اس شخص کے ساتھ چلے، اس شخص نے علیحدگی میں بڑے ادب و احترام سے عرض کیا:-

"فقیر صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہمیں آپ کی یہاں تشریف آوری کی اطلاع تھی، اس لئے آپ کے سفر کے انتظامات کردیئے گئے ہیں، آپ جہاں جہاں سفر کرنا چاہیں ہمیں اطلاع دے دیجیئے تاکہ حفاظتی انتظامات کردیئے جائیں۔"

یہ تھی کرامت قائد ملت کی، بقول جلیل ؎

جو میں چلوں تو سایہ بھی میرا ساتھ نہ دے — جو تم چلو، زمین چلے، آسمان چلے

اب کیا تھا، آگ گلزار ہوچکی تھی، قائد ملت کی زبان نے اہل سرحد کے دلوں کو مسخر کر لیا اور ان

ے مکاتیب بہادر یار جنگ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء ص ۲۵۸۔

مسلم لیگ کا نقش بٹھا دیا، اور ایسا بٹھایا کہ جب انتخابات ہوئے تو اسی سرحد میں جہاں لیگ کا نام لینا جرم تھا، لیگ ہی لیگ کی کامیابی رہی۔ ؎

لیگ کی تعمیر و استحکام میں اہم کردار

پیر علی محمد راشدی، جن کو نواب صاحب کی رفاقت کا موقع خوب ملا ہے وہ اپنے ایک طویل مضمون "بہادر یار جنگ علیہ الرحمۃ والغفران" میں نواب صاحب کی خدمات کا اظہار اِن الفاظ میں کرتے ہیں!۔

"ابھی عرض کر چکا ہوں کہ مسلم عوام کو تین پارٹیوں کی طرف سے دعوتِ شمولیت مل رہی تھی (سرکاری پارٹی، کانگرس اور لیگ) اور وہ سوچ رہے تھے کہ کس طرف جائیں، یہی موقعہ تھا جب ایک سپاہی سرزمینِ دکن سے روانہ ہوا، غالباً یہ تہیہ کئے ہوئے کہ وہ اپنے ایک ہی عمل سے نہ فقط تاریخ کے سارے نئے پرانے قرضے ادا کر دیگا بلکہ مستقبل کی تاریخ کو بھی ہمیشہ کے لئے اپنا مقروض بنا لیگا ــــ یہ شخص سیدھا پہنچا، قائد اعظم سے سیاسی بیعت کی۔ اُن کے عَلَم کے نیچے کھڑے ہو کر، ملّتِ اسلامیہ کے اس بلالِ ثانی نے مسلم عوام کو صدا دی۔ "مسلم ہو تو مسلم لیگ میں آؤ"۔ اب یہ "مسلم ہو تو. . . . ." کی شرط بڑی اہم چیز تھی، یہی روح تھی اس تحریک کی جو شروع ہو رہی تھی، یہی ابتدائی نقطہ تھا بننے والی تاریخ کا، یہی نچوڑ تھا اُس جذبہ کا جو ہماری ساری ظاہری بے سرو سامانیوں اور جہالتوں کے باوجود ہم کو آگے لیجانے والا تھا، یہی خشتِ اوّلین تھی، اس بنیاد کی جس پر بعد میں پاکستان کی عمارت کھنچنے والی تھی، ــــ اس راستہ پر مسلم عوام کو لے چلنے والے تو یقیناً قائد اعظم تھے مگر جب مسلمانوں کا قافلہ اُس راستہ پر چل رہا تھا تو کسی مسافر نے مشعلِ راہ ضرور بہادر یار جنگ کے ہاتھ میں دیکھی تھی، ــــ یہ وہی تھے جو راستے کے زیر و بم پر روشنی ڈالتے چل رہے تھے، یہ وہی تھے جو راستہ کے ہر موڑ کی حقیقت اور اہمیت سمجھاتے جاتے تھے، یہ وہی تھے جو تھکے ماندے اور متذبذب مسافروں کو تھپتھپاتے چلے جاتے تھے ــــ جب کبھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر کانگرسی (خواہ بعض لیگی) مولوی صاحبان کی پراسرار سوائی یا انگریزی خواں طبقہ کی طرف سے "نئے وقت کی نئی ضرورت" کے بہانہ اعتراضات ہوئے، تو اکثر بہادر یار جنگ بلائے جاتے تھے، اور اُن کی تصریحات سُنکر لوگوں کی آنکھیں کُھل جاتی تھیں، اُن کے دلوں سے وسوسے اور شبہات ختم ہو جاتے تھے اور نئی ہمت کے ساتھ وہ اس قافلہ میں شامل ہو کر آگے چل پڑتے تھے، ــــ ایک حقیقت بڑے سے بڑے ان مسیلمہ کذّاب سے بھی غالباً چھپائے نہیں چھپے گی کہ مسلم لیگ تحریک کے دوران مرحوم نے یہ ایک وقت بلالؓ اور غزالیؒ کے فرائض سرانجام دیئے اور وہ قطعاً فیصلہ کن ثابت ہوئے، ممکن ہے بعض ناواقف یا فرومایہ لوگ یہ کہدیں کہ بہادر یار جنگ محض اچھے مقرر تھے اور بس ــــ مگر یہ کب ہوا، کہ محض تقاریر یا خطابت سے قوموں کی قسمتیں بدلیں؟ ــــــــ

؎ حیاتِ بہادر یار جنگ۔

بہادر یار جنگ مرحوم کی عظمت کا حقیقی سرچشمہ اُن کی زبان نہیں، بلکہ اُن کا دل درد آشنا تھا۔ کئی اور صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک ہونے کے سوا بہادر یار جنگ مرحوم اپنے وقت کے بہت بڑے مدبّر اور ڈپلومیٹ بھی تھے۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک لیگ کی سیاست میں کئی بار بحرانی حالات پیدا ہوئے، اور تقریباً ہر موقع پر بہادر یار جنگ مرحوم کی معاملہ فہمی، اس کا سیاسی تدبّر، اُن کا تحمّل اور بُردباری قوم کے کام آئے، کبھی ظاہر اور کبھی پس پردہ ـــــــ

یہ موقع نہیں کہ اُن کے سارے واقعات کی تفصیل دی جائے، میں صرف اشارۃً اُسی دور کے بعض ایسے معاملات اور واقعات کا حوالہ دے رہا ہوں جن کے سلسلہ میں خاکسار نے بہادر یار جنگ مرحوم کو بڑی مستعدی سے بڑا ہی اہم پارٹ ادا کرتے ہوئے دیکھا، مثلاً:-

۱۔ پنجاب کی حکمران یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے معاملات،

۲۔ جناح سکندر پیکٹ۔

۳۔ قرار دادِ پاکستان کے حق میں مسلم اکثریت والے صوبوں کی برسرِ اقتدار پارٹیوں کی رائے ہموار کرنا۔

۴۔ مسلم اقلیت والے صوبوں کے دو چار مسلم لیگی حضرات نے پس پردہ یہ بات چلا رکھی تھی کہ ہندوؤں کو پاکستان کے نام سے ڈرا دھمکا کر اُن سے اس بات پر سمجھوتہ کر لیا جائے کہ بھارت کے ہر صوبہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی ہو، یعنی مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کو ۵۰ فی صدی نمائندگی دی جائے اور جب یہ اصول قبول ہو جائے تو پاکستان کا مطالبہ چھوڑ دیا جائے، بہادر یار جنگ نے اس پس پردہ تحریک کو ختم کر دیا۔

۵۔ خاکسار اور مسلم لیگ کا تنازعہ، اور خاکسار فتنہ کا خاتمہ۔

۶۔ برطانیہ کی قائم کردہ قومی دفاعی کونسل (National Defence Council) کے سلسلہ میں بحران اور مسلم وزرائے اعلیٰ کے مسلم لیگی ارکان کی سرکشی کا امکان،

۷۔ مدراس میں مسلم لیگ اجلاس کے موقعہ پر قرار دادِ پاکستان کو لیگ کے اغراض و مقاصد میں داخل کرتے وقت جو اندرونی اختلافات پیدا ہو رہے تھے، اُن کو روکنے کا بندوبست۔

۸۔ ریاستوں میں بسنے والے مسلمانوں کو حیثیتی کانگریس کے اثر سے نکال کر مسلم لیگ کے قریب لے آنا کہ والیانِ ریاست بھی حد سے زیادہ برہم ہو کر مسلم لیگ کے خلاف ہندوؤں کا ساتھ نہ دیں۔

۹۔ جمیعت العلماء (ہند) کے پیدا کردہ مسائل۔

۱۰۔ بعض مسلم لیگی علماء کے اعتراضات۔

۱۱۔ حیدر آباد کا مسئلہ۔

۱۲۔ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی تنظیم۔

۱۳۔ ہندوستان بھر میں انتخابات۔

یہ اور اس قسم کے کچھ اور معاملات تھے، جن کے سلسلے میں محض تقریروں اور حسن خطابت سے کام نہیں چل

تھا، معاملہ فہمی، تدبیر، تحمل، سنجیدگی اور اعلیٰ قسم کی ڈپلومیسی کی ضرورت تھی، بہادر یار جنگ مرحوم نے حضرت قائداعظم کی قیادت و رہنمائی میں ان مسائل کے بارے میں اپنا پارٹ ادا کرتے ہوئے ان ساری خوبیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ مظاہرے کئے۔" [۱]

باہر والوں کو مرحوم کی یہ ترقی اور ان کا یہ اثر کھٹک رہا ہوگا تو کون سے شبہ کی بات ہے، خود حیدرآباد میں جہاں روحِ حیات اُن ہی نے پھونکی تھی، اور جن کی وجہ سے "بٹیروں" نے بھی "شاہبازی" کی "رسم و راہ" سیکھنی شروع کی تھی، اُن پر حسد کرنے لگے، صاف کہنے کی جرأت کہاں سے لاتے، البتہ جب زبان بندی کی مدت ختم ہوئی تو ایک جلسہ کیا گیا، مرحوم کی خدمات پر آفرین کہی گئی اور ساتھ ہی حسد کی چنگاری کو ہمدردی کی راکھ میں لپیٹ کر اس طرح پیش کیا گیا، کہ "آپ حیدرآباد ہی کے ہو جائیں، حیدرآباد ہی آپ کی تمام تر توجہ کا محتاج ہے، بیرونی مصروفیات سے حیدرآباد کے امور کی بجا آوری پورے طور پر نہ ہوسکیگی، وغیرہ"

حالانکہ یہاں کا سب سے زیادہ بار مرحوم ہی کے دوش پر تھا اور سب سے زیادہ کام (باوجود ان مصروفیات کے) مرحوم ہی کیا کرتے تھے۔

مرحوم نے سپاسنامے کا جواب ان الفاظ میں دیا، جو اُن کی بصیرت کا بہترین نمونہ ہے:۔

"میرا مقصدِ حیات ایک اور متعین ہے، اور وہ ملّتِ اسلامیہ کی خدمت ہے، آپ عام طور پر تمنّا کر سکتے ہیں کہ میں ملت اسلامیہ کے ساتھ "دکن" کا لفظ بڑھا دوں اور مجھے اس میں عذر نہیں ہے، کیونکہ میں خود دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں عالم ارضی پر بسنے والی ساری ملّتِ اسلامیہ کی خدمت کر سکتا ہوں، مجھے اپنی محدود طاقت اور صلاحیت کا اندازہ ہے، خود انبیاء علیہم السّلام کے حدودِ عمل، جن کے ساتھ وحی و الہام کی طاقتیں ہوا کرتی تھیں، ہمیشہ محدود رہے، اور ساری صفِ انبیاء میں صرف ایک قدسی مرتبت ذات ؑ ہم کو ایسی ملتی ہے جس کے حدودِ عمل کافۃ الناس کے لئے بسیط ہیں، اُن کے غلاموں کی خاکِ پا کو اپنے لئے سرمۂ چشمِ بصیرت سمجھتا ہوں، غیر محدود خدمت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، بے شک میرا مخدوم ملّتِ اسلامیہ "دکن" ہے۔

لیکن! آپ کو جاننا چاہیئے حیدرآباد، ہندوستان کے سمندر میں ایک جزیرہ ہے، اس سمندر سے جتنی سیاسی لہریں اٹھتی ہیں وہ لازماً اس جزیرہ سے ٹکراتی ہیں، اور کوئی شخص ملتِ اسلامیہ دکن کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا جب تک وہ ہندوستانی سمندر سے اٹھنے والی سیاسی لہروں پر قابو نہ رکھتا ہو یا کم از کم ان سے قریب ترین یا راست واقفیت نہ رکھتا ہو، میری تمام بیرونِ حیدرآباد مساعی کی علّتِ غائی ان لہروں سے قریب تر رہنے کی تمنّا ہے ـــــ کوئی شک نہیں کہ حیدرآباد سے

---

[۱] روزنامہ جنگ کراچی ۲۰ جون ۱۹۶۲ء

باہر قدم رکھنے کے بعد میری روشنیٔ طبع، میرے لئے بلا ہو گئی اور میرے نغموں نے ہر چمن میں میرے لئے ایک دام بچھا دیا اور ہر صوبۂ ہند نے چاہا کہ میں اُس کے قفس کا اسیر ہو جاؤں لیکن آپ اطمینان رکھیں، دام چاہے کیتنے ہی ہم رنگِ زمین ہوں، اُن کو پہچانتا ہوں اور اگر کبھی اُن میں پھنسا بھی ہوں تو عمداً اور اپنے پروں کی طاقت کا اندازہ کر کے اس یقین کے ساتھ پھنسا ہوں کہ دام لے کر اُڑوں گا اور صیاد سمیت حیدرآباد سے قریب تر کر دوں گا۔"

(مارچ ۱۹۴۴ء دارالسلام)

اتنے صاف صاف اور سچے سچے خیالات کو پیش کرنے کے باوجود بعض نادان دوستوں کو اب بھی یہی خیال دامنگیر رہا کہ قائدِ ملت ہمارے ہی لئے مخصوص ہو جائیں، چنانچہ اسی سلسلہ میں ضلع ورنگل کے مسلمانوں نے ایک سپاسنامہ پیش کیا، جس میں وہی سوال اٹھایا گیا۔ اب کی دفعہ مرحوم نے پھر جتایا!۔

"لب کشائی پر مبارکباد دینے کی بجائے زبان بندی پر دی جانی چاہئیے تھی، اللہ کا فضل ہے کہ اس نے زاغ و زغن میں سے نہیں بنایا، بلکہ ؎

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہین کردہ اند

میرا دل دکھتا ہے جب دیکھتا ہوں کہ وہ تعلقِ خاطر جو اپنی تنظیم اور اپنے مرکز سے ہونا چاہیئے، صدرِ جماعت اور قائد سے ہوتا جا رہا ہے، ملتِ اسلامیہ کے تعلق کو اشخاص سے دیکھ کر مجھے ڈر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق خدا سے کم نہ ہو جائے۔ ایسی حالت میں اگر میں صرف باہر کا ہو جاؤں تو تعجب نہ ہونا چاہیئے، اسی لئے اشخاص سے آپ کا تعلق توڑ کر اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنے لگیں۔"[۱]

نواب بہادر یار جنگ کو عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وافر حصہ ملا تھا۔ بلکہ یہی اُن کی اصل پونجی تھی۔ علماء مشائخ کے ساتھ بھی نہایت گہرے روابط تھے۔ مکاتیبِ بہادر یار جنگ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی دہلوی، میر غلام بھیک نیرنگ، مولانا قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی، مولانا نذیر احمد خجندی (مولانا شاہ احمد نورانی کے تایا ابا) مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا کرم علی ملیح آبادی، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، مولانا عبدالباقی برہان الحق جبلپوری (خلیفہ مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی) اور سنوسیٔ ہند امیرِ ملت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری سے نواب صاحب کے خصوصی روابط تھے۔ حضرت امیرِ ملت قدس سرہ، سے تو نواب صاحب کو حد درجہ عقیدت و محبت تھی۔[۲] حضرت جب بھی حیدرآباد دکن تشریف لاتے تو نواب صاحب بصد ادب و احترام حاضرِ خدمت ہو کر فیوضِ باطنی حاصل کرتے۔

---

[۱] حیات بہادر یار جنگ ص ۱۴۰ تا ۱۴۲، بحوالہ رہبر دکن، ۱۱ اپریل ۱۹۴۴ء [۲] مکاتیب بہادر یار جنگ ص ۵۱۔

۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو ظہر کے وقت خاکسار کارکن رفیق صابر مزنگوی (لاہور) نے قائد اعظم پر قاتلانہ حملہ کیا اور حملہ کی خبر اسی شام بمبئی ریڈیو نے نشر کی۔ حضرت امیر ملت قدس سرہ، اُن دنوں حیدر آباد دکن میں جلوہ افروز تھے۔ رات کو نواب بہادر جنگ عجیب پریشانی کے عالم میں آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور یہ خبر سنائی۔ حضرت اقدس کو اس خبر سے بہت رنج ہوا اور فوراً رو بقبلہ ہو کر قائد اعظم کی صحت و سلامتی اور درازیٔ عمر و کامیابیٔ مقاصد کے لئے دعا مانگی۔ دوسرے دن حضرت نے بقلم خاص قائد اعظم کے نام ہمدردی و مزاج پرسی کے طور پر ایک مکتوب تحریر فرمایا اور جب نواب صاحب کی تجویز اس کا انگریزی میں ترجمہ ٹائپ کرا کے اصل تحریر کو اس کے ساتھ منسلک فرمایا اور اس کے علاوہ ایک نادر قلمی نسخہ قرآن مجید، ایک مخملی جانماز، ایک تسبیح، ایک شال، ایک زمزمی آبِ زمزم اور دیگر اشیاء بذریعہ حضرت بخشی مصطفےٰ علی خان (ڈی ایس پی بنگلور خلیفۂ امیر ملت) قائد اعظم کو روانہ فرمائیں۔ ۱؎

نواب صاحب اپنی زیست کی آخری سانس تک مذہب و ملت کی خدمت میں منہمک رہے۔ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء توار کے روز دن کے ساڑھے گیارہ بجے آخری تقریر فرمائی۔ اسی شام کو آپ کے دولت کدے "بیت الامت" میں درسِ اقبال کی محفل تھی۔ آپ ہمیشہ کی طرح اس مقدس محفل میں شریک رہے ــــ البتہ دو چار روز سے یہ مصرعہ وردِ زبان اور بار بار عجیب پُر اثر انداز میں پڑھتے جاتے تھے ۔ ع

حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

غرض زبان سے اور اپنے حال سے تشریحِ اقبال میں معاونت فرماتے رہے، اقبال کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کی جلالی آخری نظم "حکمتِ کلیمی" کا یہ شعر یاد ہے ؎

مردِ حق افسوں این دیرِ کہن
از دو حرف ربی الاعلیٰ شکن

شعر کی توضیح ہو چکی تو مرحوم نے فرمایا کہ یہ مقامات جلد گزرنے کے نہیں، آج یہیں ٹھہر جائیں۔ درس ختم ہو گیا۔ ــــ اسی رات نواب مرحوم کی، اپنے ایک قدیم دوست جسٹس ہاشم علی خاں کے ہاں دعوت تھی، کسے خبر تھی کہ یہ دراصل دعوتِ مرگ ثابت ہوگی، مغرب کی نماز پڑھ کر مرحوم اپنے دوست کے گھر "بنجارہ ہل" تشریف لے گئے۔ مرحوم کے ساتھ گوالیاری نواب اور ایڈوکیٹ نیابت اللہ قریشی تھے جو اسٹیٹس مسلم لیگ کے تعلق سے نواب صاحب سے قریب ہوئے اور بظاہر قریب تر ہونے کے لئے حیدر آباد ہی چلے آئے تھے اور یہیں رہ پڑے۔ مشہور عام روایت یہ ہے کہ انھوں نے دورانِ راہ موٹر میں ایک پان کا بیڑا نواب صاحب کو پیش کیا اور نواب صاحب نے کھا لیا۔ ہاشم علی خاں صاحب کے گھر پہنچے تو یہاں ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی اور دیگر احباب پہلے ہی سے موجود تھے۔ نواب صاحب، ڈاکٹر رضی الدین کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے اور ابھی چونکہ درسِ اقبال کی محفل سے اٹھ کر آ رہے تھے، اس لئے طبیعت پر وہی اثر تھا،

۱؎ تذکرہ شہ جماعت از سید حیدر حسین علی پوری، لاہور ۱۹۷۳ء ص ۱۰۰، ۱۰۱۔

اپنے پرکشش انداز میں کلامِ اقبالؔ کے محاسن بیان فرمانے لگے، کھانے میں ذرا دیر تھی، وہ پان جو موٹر میں کھلایا گیا تھا، اس میں نہ جانے کیا بلا تھی کہ اس کے اثر سے نواب صاحب کے معدہ میں بھوک کی ناقابلِ ضبط کھرچن پیدا ہوئی اور بے چین ہو کر بالکل خلافِ عادت انھوں نے ہاشم علی خاں صاحب سے کہا، "بھئی آخر کھانا کب لگے گا، جلدی کرو" ــــــ ہاشم علی خاں اہتمام میں لگ گئے، ادھر کسی نے ایک حقہ نواب صاحب کے آگے لا رکھا، نواب صاحب ایک کش بھی پورا نہ لے سکے تھے کہ ایک زبردست جھٹکا لگا اور اس کے بعد معاً ایک تشنجی دورہ پڑا کہ وہ منہ کے بل گر پڑے اور ابھی لوگ سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ "مردِ حق" دیرکہن کے "افسوں" کو توڑ کر ربی الاعلیٰ سے جا ملا۔ اِنّا للّٰہِ وَاِنّا اِلیہِ رَاجِعُون۔

"بنجارہ ہل" سے نعش "بیت الامت" لائی گئی، تکفین کے بعد لاکھوں کے غمگسار مجمع نے دارالسلام کے وسیع میدان میں نمازِ جنازہ پڑھی اور یہاں سے اپنے محبوب قائد کی نعش کندھوں پر اُٹھائے شہر سے چار میل دور مشیر آباد کے ایک گوشہ میں دفن کر دی گئی۔

کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر
ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

جس وقت جنازہ بیت الامت سے اُٹھایا گیا تو لوگوں نے دیکھا اور انتہائی تعجب سے دیکھا کہ بچاسوں بیوائیں، سینکڑوں بے یار و مددگار روتے روتے نیم مردہ ہو چکے تھے اور اُن کی سسکیوں کے ساتھ اگر کوئی آواز آتی تھی تو یہی کہ "اب ہم کس کے سہارے جیئں گے"؟ لوگ سمجھتے تھے کہ بہادر یار جنگ کی داد و دہش مجلس اتحادالمسلمین یا ملک کے چندے ہی تک محدود تھی، آج یہ بھید کھلا کہ خفیہ ہاتھ سینکڑوں کا سہارا بنا ہوا تھا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ چار میل کی طویل مسافت محمد بہادر خاں کے جنازہ نے جن کندھوں پر طے کی وہ غریبوں ہی کے کندھے تھے، یہ غریب اس غریب نواز کی نعش سے کچھ اس طرح لپٹے رہے کہ دوسروں کو ہاتھ لگانے کا موقع ہی نہ دیا۔

غرض ۳؍رجب المرجب ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۵؍جون ۱۹۴۴ء شب دوشنبہ وہ مبارک ساعت تھی، محمد بہادر خاں کے حق میں، جبکہ اُن کی بے تاب رُوح ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو گئی۔ لیکن آہ ثم آہ، کتنی الم انگیز اور روح فرسا تھی یہ رات مسلمانانِ ہند کے حق میں جبکہ اُن سے اُن کا حقیقی میر کارواں چھن گیا، اُن کی متاعِ عزیز لُٹ گئی۔ ع

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

ہر طرف غل اُٹھا، ایک شور بپا ہوا کہ یہ موت تھی یا شہادت؟ واقعی یکایک حرکتِ قلب رُک گئی یا اُس کے سامان فراہم کئے گئے؟ صاف اور بے غبار بات یہی ہے کہ یہ کام ایک منصوبہ کے تحت ہوا۔ پان میں یا حقہ میں سنکھیا ملایا گیا، جس کے اثر سے مرحوم کے جسم پر بڑے بڑے سیاہ داغ پڑ گئے تھے، فوری طور پر ڈاکٹروں نے بھی زہر رسانی ہی کی تصدیق کی اور خود نظامِ دکن اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں مرحوم نے بھی (جو باضابطہ طب پڑھے ہوئے تھے) نعش دیکھ کر یہی ارشاد فرمایا:۔

"جس کسی نے کیا بہت بُرا کیا۔"

حبیدرات مرحوم نے وصال فرمایا، بہت سے صاحب دل اور نیک بزرگوں کو مختلف بشارتیں ہوئیں اور بعد میں ہوتی رہیں۔ صرف ایک بشارت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

امجد حیدر آبادی (مشہور صوفی منش رباعی گو شاعر) نے خواب میں دیکھا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور آپ کے دونوں جانب حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) تشریف رکھتے ہیں، ایسے میں ایک جنازہ پیش ہوا، صحابہ نے عرض کیا۔

"حضور یہ کس کا جنازہ ہے"؟

ارشاد مبارک ہوا:

یہ میرے حبیب محمد بہادر خاں کا ہے۔

اس کے بعد اور کچھ تعریف کے الفاظ نطقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکل رہے تھے کہ امجد صاحب کی آنکھ کھل گئی۔

اللہ اللہ کیا شرف ہے اور ابدی زندگی کی کیسی روشن صبح ہے!

محمد بہادر خاں کا عشقِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں چلنا، تڑپنا رائیگاں نہ گیا، خوب ہی داد ملی اور یقین ہے کہ جو بھی یہ شیوہ اختیار کرے گا۔ اُس کو ایسا ہی اجر ملیگا! ؎[1]

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نظامِ دکن نے یہ قطعۂ تاریخ وفات کہا۔ ؎

گرفتہ بخششے از دستِ قادر — برائے حفظِ حقِ قوم نادر
بگفتہ کارِ او در گوشِ عثماں — بہادر بُود و خود در جنگ ماہر

۱۳۶۳ھ

خیامِ ثانی حضرت امجد حیدر آبادی نے نواب صاحب کے سانحۂ رحلت پر یہ دو عارفانہ رباعیاں کہیں۔ ؎

(۱)

تجھ سے تھا وطن کا نام مرنے والے — کیا کر گیا واہ، مرنے والے
لاکھوں نے پڑھی تیرے جنازہ کی نماز — تجھ پہ لاکھوں سلام مرنے والے

(۲)

اللہ رے بہادری بہادر خاں کی — اپنی ہر چیز حق کی خاطر دے دی
اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں دے کر — اک جان بچی تھی وہ بھی آخر دے دی

مستقل تصنیف و تالیف و ترجمہ کرا[illegible]

---

[1] حیات بہادر یار جنگ ص ۱۵۰ تا ۱۵۸۔

ذکر میں یا [illegible] کے محکم مبلغ،
نواب بہادر یار جنگ [illegible]

محمد انیس الرحمن ایڈوکیٹ

نواب بہادر یار جنگ

ایک نفسیاتی جائزہ

مفکرین کی آرا کے پیش نظر شخصیت کی تعمیر میں وراثت اور ماحول اپنے اثرات نمایاں طور پر مرتب کرتے ہیں۔ جب کبھی کسی شخصیت کے متعلق رائے زنی مقصود ہو تو اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ہوگا۔ اس کی وراثتی ذہنوں کو پرکھنا ہوگا جس ماحول میں وہ پروان چڑھا ہے اس کا نفسیاتی طور سے جائزہ لینا ہوگا۔ ان کے بعد شخصیت کی تعمیر کے متعلق صحیح نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ بہت سے لوگ وراثت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں خصوصیت کے ساتھ حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں۔ ؎

ہیچ صیقل نکو نداند کرد آہنے را کہ بدگہر باشد

لیکن بعضوں کے نزدیک ماحول کے اثرات سے کبھی تقدیر بدل جاتی ہے اس سلسلے میں اقبالؔ کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔ ؏ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ ماہرین نفسیات متفق ہیں کہ دو اسباب سے شخصیت میں نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ (۱) حیاتیاتی کمزوریاں۔ (۲) ثقافتی اقتصادی ماحول۔

ماہرین نفسیات کے اقوال سے بھی وہی بات ثابت ہوتی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ یعنی وراثت اور ماحول ہی تعمیر شخصیت میں حصہ لیتے ہیں۔ ماہرین نفسیات نے ان افکار کے اظہار کے لئے سائنسی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ تعمیر شخصیت میں جغرافیہ اور تاریخ نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ تشریح بھی الفاظ کی تبدیلی ہے تان وہیں ٹوٹتی ہے کہ وراثت اور ماحول شخصیت کو تعمیر کرتے ہیں۔ وراثت تاریخ ہے ماحول، جغرافیہ۔

وراثت

نواب بہادر یار جنگ ایک پٹھان گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ پٹھان من حیث القوم سپہ گری کے لئے شہرۂ آفاق ہیں۔ جسامت کے لحاظ سے بھاری بھرکم گورے چٹے لمبے تڑنگے اور ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ نہایت حسین و خوبصورت شخصیت تھی۔ شکل سے وجاہت ٹپکتی تھی۔ گھنی داڑھی تھی۔ داڑھی چہرے پر بہت بھلی لگتی تھی۔

آواز

ہندوستان کی سرزمین میں مولانا آزاد سبحانی مولانا عبدالماجد بدایونی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا
مناظر احسن گیلانی اور مولانا قمر در بھنگوی اردو زبان کے چوٹی کے مقرر گزرے ہیں۔ لاکھوں کے
مجمع کو مخاطب کرتے اور انھیں مسحور اور متکیف کر دیتے تھے۔ ان باکمال مقررین کی تقریریں دلوں میں اتر جاتی
تھیں۔ بہادر یار جنگ کی آواز بھی بہت دلکش اور دل آویز تھی اس میں بلند آہنگی بھی تھی۔ ان کی تقریر
بھی دلوں کو برماتی اور سامعین کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ ابوالکلام آزاد کے شکوہ الفاظ سے سننے والے
مسحور ہو جاتے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی کی تقریر کے فلسفیانہ اور منطقیانہ افکار و نظریات سامعین کو وجد کرنے
پر مجبور کر دیتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کی تقریر میں سیلاب کی روانی اور طوفان کا زور ہوتا تھا جس سے
لوگ گم سم ہو جاتے تھے لیکن بہادر یار جنگ کی تقریر میں سادگی اور صفائی، فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس طرح
ہم رکاب رہتی کہ جو سنتا سر دھنتا۔ ان کا اندازِ بیان سامعین کو شعلہ بداماں بھی کر دیتا تھا۔

جاگیرداری وراثت میں حاصل ہوئی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے نیازی بھی وراثتاً منتقل ہوئی تھی۔
دولت اور شرافت سے ان کی شخصیت کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ان کی زندگی عوامی تھی۔ جاگیردارانہ حشم و
خدم کی رسائی ان تک نہیں تھی اور نہ طمطراق کو ان کی زندگی میں کوئی جگہ حاصل تھی۔ گھرانا مذہبی تھا، والد
اسلام کے شیدائی تھے اسی لیے بہادر یار جنگ کی شخصیت میں مذہبی اثرات رچے بسے ہوئے تھے۔ لڑکپن
ہی سے ملی فلاح و بہبود کی طرف راغب تھے۔ عیش و طرب، لاابالیانہ انداز، لہو و لعب سے دلچسپی،
اسراف بیجا، امارت پر فخر و مباہات، یہ سارے تقاضے جاگیردارانہ زندگی کے سرمایہ ہیں لیکن بہادر یار جنگ
کی شخصیت میں یہ سارے اطوار مفقود تھے۔ ان سے ملنے جلنے، ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ان کی صحبت میں
رہ کر ان کو سمجھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جاگیرداروں میں اس لیے ممتاز تھے کہ وہ بہادر خاں تھے
بہادر یار جنگ نہ تھے۔

بہادر یار جنگ اور خاکسار تحریک

ع سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

بہادر خاں کو بہادری بھی وراثتاً حاصل ہوئی تھی۔ یہی خاندانی جرأت و ہمت خاکسار تحریک کی
طرف مائل کرنے میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوئی ان کا تعلق یوسف زئی قبیلہ سے تھا ان کا خاندان
جنگی مہارت میں ممتاز رہا اور بہت سی جنگوں میں داد شجاعت حاصل کرتا رہا۔ اسی لیے جب ۱۹۳۱ء میں خا
تحریک شروع ہوئی تو بہادر یار جنگ نے اپنے فطری رجحانات کے پیش نظر اس تحریک میں شمولیت اختیار
کر لی۔ اس تنظیم میں باضابطہ پریڈ ہوتی۔ سڑکوں پر مارچ پاسٹ ہوا کرتا تھا۔ جب و راست کی صداؤں
سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ بندوق کی جگہ بیلچہ اسلحہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کی
وجہ سے خاکسار تحریک ہندوستان کے طول و عرض میں بہت زور و شور سے پھیلی۔ بہادر جنگ نے

اس فوجی تحریک میں شرکت کی تو ان کی ذات میں بھی مجاہدانہ اسپرٹ کا مظاہرہ ہونے لگا جو اس جماعت کی شایانِ شان تھی میدان میں بیلچہ لئے وہ دوسرے خاکساروں کے ساتھ پریڈ میں شریک ہوتے تھے اور جب کوئی غلطی سرزد ہوجاتی تو تادیب کے لئے بھی تیار رہتے تھے۔ تادیبی کارروائی کو جسے انھوں نے بخوشی قبول کیا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ پریڈ کرنی ہوتی تھی جسے وہ بہ حسن وخوبی انجام دیتے تھے۔ ان کی سچائی دیانتدار خلوص اور بے نیازی نے انھیں ایک ممتاز خاکسار لیڈر بنادیا۔ ان ہی کی جیسی عظیم شخصیتوں نے اس تحریک میں جان ڈال دی اور اسے مسلمانانِ ہندوستان کی فوجی طاقت کا مرکز بنادیا۔

سنہ ۱۹۴۰ء

۱۹ر مارچ کا دن خاکسار تحریک کے لئے انتہائی المناک تھا۔ لاہور کی سرزمین میں خاکساروں کو سر سکندر حیات خاں کی حکومت نے گولیوں کا نشانہ بنایا۔ خاکسار سر سکندر کی حکومت سے دل برداشتہ تھے۔ اس دن رضاکاروں نے حکومتِ وقت سے ٹکر لینے کی ٹھانی تھی۔ گولیوں کی بارش میں متعدد خاکسار جاں بحق ہوگئے لیکن انھوں نے بھی اپنے بیلچوں ہی سے سرکاری فوج کی خوب خبر لی۔ پولیس والوں کے سر قلم کردیئے۔ ایس۔پی جائے وقوعہ پر زخموں سے چور ہوگیا اور جانبر نہ ہوسکا۔ لاہور میں ایک کھلبلی مچ گئی ایک ہیجان برپا ہوگیا سیاسی ابتری پھیل گئی سر سکندر کی وزارت کو انتشار اور لاقانونیت کا سامنا تھا۔

۲۲ر مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

۲۳ر مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا بہت ہی اہم اجلاس منعقد ہونیوالا تھا۔ لیکن چند یوم قبل لاہور کی سرزمین میں خاکسار رضاکاروں کا خون پانی کی طرح بہادیا گیا جس کی وجہ سے امن وامان خطرے سے ہمکنار تھا۔ سر سکندر کی وزارت نے مسٹر جناح سے استدعا کی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس جو ۲۳ر مارچ کو منعقد ہونے والا ہے اسے ملتوی کردیا جائے لیکن مسٹر جناح نے سر سکندر کی اپیل مسترد کردی اور بیان جاری کیا کہ ۲۳ر مارچ کو اجلاس ضرور منعقد ہوگا اس لئے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے جلسے میں شرکت کے لئے مندوبین کی اچھی خاصی تعداد سفر اختیار کرچکی ہے۔ راقم الحروف بھی صوبہ بہار سے دو سو مندوبین کے ساتھ ریزرو کمپارٹمنٹ میں سفر کررہا تھا۔ پٹنہ سے گاڑی روانہ ہوچکی تھی۔ راستے میں خبر ملی کہ خاکساروں پر گولی چلی اجلاس ملتوی ہونے والا ہے لیکن کچھ آگے بڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ملتوی نہیں ہوا۔ ہمت بندھی۔ ہم لوگوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ لاہور پہنچے۔ مسلم لیگ پنڈال میں قیام کیا۔ مارچ کے مہینے میں بھی خاصی سردی پڑ رہی تھی۔ پنڈال میں پوال بچھا ہوا تھا جس پر بستر لگا دیا گیا۔ ہم لوگ زمین پر دراز ہوئے

بہادر یار جنگ اور لاہور

بہادر یار جنگ کی شخصیت چونکہ خاکساروں میں نمایاں تھی اس لئے قائداعظم محمد علی جناح نے بہادر یار جنگ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ بار امن وامان بحال کرنے میں حکومت کی امداد واعانت کریں۔ خاکسار رضاکار غم وغصہ کو اپنے

دامن میں سمیٹے مقامی امن دامان کی ذمہ داری نظر انداز کر کے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ لاہور کی سرزمین میں امن و امان قائم کرنا سر سکندر وزارت کے بس کی بات نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے اجلاس کے کامیاب انعقاد کے لئے ضروری تھا کہ لاہور کی فضاؤں میں جو کشیدگی پیدا ہو گئی اور خون کے فواروں نے جو شہادت کی تمناؤں کو بیدار کر دیا تھا اس کو یکسر تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ انتشار کی جگہ امن و سکون قائم کیا جائے۔ آتش بار ماحول میں برف کی سی برودت پیدا کی جائے۔ تنازع کو رفع دفع کیا جائے بھائی چارگی پھیلائی جائے۔

مسٹر جناح کی تجویز پر بہادر یار جنگ لاہور تشریف لے گئے۔ خاکسار رضا کاروں کو اپنی سحر بیانی سے امن و امان کا پیغام دیا۔ فضا کو متوازن رکھنے کی اپیل کی۔ بہادر یار جنگ کی تقریروں نے پھیلی ہوئی کشیدگی کو یک لخت نابود کر دیا۔ انھوں نے خاکساروں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کو امن و سکون کے ساتھ منعقد ہونے دیا جائے۔ اور سیاسی فضا کو کسی حال میں مکدر نہ کیا جائے۔ ان کی جادو بیانی رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔ مقامی کشیدگی کو ارتباط سے نفرت کو محبت سے، دشمنی کو دوستی سے، ناچاقی کو صلح سے تبدیل کر دینے میں بہادر یار جنگ نے بے مثال کردار ادا کیا۔ سر سکندر کی وزارت عتاب میں گرفتار ہو گئی تھی۔ مسلم لیگ نے خاکساروں کے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کو انصاف مہیا کرنے کی ضمانت دی۔ اگر خاکسار راضی نہ ہوتے اور کشیدگی کی فضا قائم رہتی تو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو کبھی منعقد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی تاریخ بدلی جا سکتی تھی اور اگر تاریخ بدل جاتی تو بہت بڑا انقلاب پیدا ہو سکتا تھا۔ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کرا دینا اور انتہائی پر سکون ماحول میں اسکو کامیابی کے ساتھ انجام دے دینا تنہا بہادر یار جنگ کا کارنامہ ہے۔ بہادر یار جنگ کی عظیم شخصیت اور خاکسار تحریک سے ان کی وابستگی نے خون آشام ماحول کو بدل کر دینے میں نمایاں کامیابی حاصل کی اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس انتہائی شاندار طریقے سے منعقد ہوا اور تاریخی کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

اجلاس لاہور

پہلے دن کے اجلاس کے بعد دوسرے دن ہم لوگوں نے ایک پروگرام بنایا کہ صبح سویرے شالیمار باغ کی سیر کی جائے۔ راقم الحروف اور حاجی مطیع الرحمٰن مرحوم اس دور میں کالج کے طالب علم تھے۔ ہم لوگ موتی ہاری ضلع مسلم لیگ کی طرف سے آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے ہم لوگوں کے ساتھ محمد جان مرحوم موتی ہاری کے مقامی تاجر بھی تھے۔ صبح سویرے ہم تینوں شالیمار کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے صبح میں آل انڈیا مسلم لیگ کا کھلا اجلاس نو بجے منعقد ہونے والا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ شالیمار کی سیر سے ہم لوگ جلد واپس آجائیں گے اور کھلے اجلاس میں شرکت کریں گے۔ شالیمار باغ کی سیر سے لطف اندوز ہونے کے بعد جب ہم لوگ واپس ہونے لگے تو باغ کے دو چار گلاب کے پھول ہاتھ میں لے لئے۔ منتو پارک پہنچ

گیارہ بج چکے تھے جب ہم لوگ مسلم لیگ پنڈال کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ قائداعظم پنڈال کے عقبی حصے کی طرف سے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ بہادر یار جنگ بھی تھے۔ ہم لوگوں نے ان کو میدان میں روک لیا۔ علیک سلیک کے بعد جو پھول ہم لوگوں کے ہاتھوں میں تھے ان کو تحفتہً پیش کئے۔ قائداعظم کو راقم الحروف نے پھول پیش کیا جسے انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا میرے ساتھیوں نے پھول بہادر یار جنگ کو پیش کیا۔ پٹنہ مسلم لیگ سشن کے بعد بہادر یار جنگ سے یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ ہم لوگوں نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ موتی ہاری ضلع مسلم لیگ کی طرف سے بحیثیت مندوب مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ قائداعظم یہ سنکر بہت خوش ہوئے۔ وہ موتی ہاری ضلع مسلم لیگ کی نمایاں اور تاریخی کارکردگی سے اچھی طرح واقف تھے۔

موتی ہاری ضلع مسلم لیگ کی تاریخی اہمیت

موتی ہاری ضلع مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء ہی مقامی بلدیہ کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا تھا اس سلسلہ میں مسلم لیگی رضاکاروں نے ستیہ گرہ بھی کی تھی۔ ان لوگوں نے مسلمان ووٹروں کو ووٹ ڈالنے سے منع کیا تھا۔ راہ روک لی تھی۔ مقامی بلدیہ کا الیکشن قومیت کی بنیاد پر لڑا جا رہا تھا جسے مخلوط انتخاب قرار دیا گیا تھا۔ ضلع مسلم لیگ متحدہ قومیت کی مخالفت پر کمربستہ تھی اس لیے کہ لکھنؤ سشن کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ جداگانہ قومیت کی بنیاد پر جدوجہد کر رہی تھی ستیہ گرہ کے سلسلے میں بے شمار مقامی مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے رضاکار گرفتار کر لیے گئے۔ مسلم لیگی لیڈروں کی یہ پہلی گرفتاری تھی قائداعظم کو مقامی مسلم لیگ کی جدوجہد کے متعلق ٹیلیگرام دیا گیا انھوں نے جواب میں موتی ہاری ضلع مسلم لیگ کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ دیوان وراثت حسین خاں ایڈوکیٹ مرحوم کو جو اس وقت موتی ہاری ضلع مسلم لیگ کے سکریٹری تھے۔ قائداعظم کا تار موصول ہوا تھا جس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

I congratulte you for the gallant struggle. I wish every district Muslim League should be as strong as Motihari district Muslim League.

سٹار آف انڈیا کے انگریزی ایڈیٹر اٹکنس نے اداریہ بھی لکھا تھا جس کا عنوان تھا:-

What Motihari does today, the rest of India will do tomorrow.

اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ پٹنہ سشن میں موتی ہاری ضلع مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم کو کھادی کی بنی ہوئی ایک شیروانی بھی پیش کی گئی تھی تاکہ اراکین مسلم لیگ اور ممبران کے درمیان ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑوں کو مقبول بنایا جا سکے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ موتی ہاری مسلم لیگ کی ابتدائی ممبرسازی کی مہم اور اس کی تنظیم جدید راقم الحروف کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ مقامی نیشنل گارڈ کا سالار اعلیٰ بھی راقم الحروف ہی تھا اور شیروانی بھی راقم الحروف ہی نے بنوا کر ضلع مسلم لیگ کی طرف سے پیش کروائی تھی۔

بہادر یار جنگ نے بھی موتی ہاری ضلع مسلم لیگ کے متعلق چند سوالات کئے۔ ان کو مقامی حالات سے

آگاہ کیا گیا۔ قائد اعظم نے ضلع کی مسلم آبادی اور ان کی اقتصادی حالات کے بارے میں سوالات کئے۔ ان کو بتلایا گیا کہ مقامی مسلمانوں کی اقتصادی حالت تشفی بخش ہے اس لئے کہ مسلمانوں کی نوے فیصد آبادی کاشتکاری کرتی ہے۔ ان میں جاگیرداری اور زمینداری کا دور دورہ نہیں ہے۔ وہ لوگ بڑے بڑے کاشتکار ہیں۔ خود زمین کے سینے کو چیرتے ہیں اور غلہ پیدا کرتے ہیں اس لئے آزادی کے دلدادہ ہیں اور معاشی حالت کا تذکرہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ دکن میں ایسا نہیں ہے حیدرآباد کے مسلمان زیادہ تر نوکری پیشہ ہیں۔ وہ لوگ کاشتکاری سے بہت کم لگاؤ رکھتے ہیں۔ قائد اعظم نے چند جملوں میں بہت سی باتیں مقامی مسلم لیگ کے متعلق دریافت کرلیں اس کے بعد سیہراں قوم ہم لوگوں سے رخصت ہوئے

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ میں انتہائی مہتم بالشان ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت بے مثال ہے۔ آج پاکستان کے تمام ہوشمند افراد تحریک پاکستان کے سلسلے میں عوام الناس کو واقعات اور حقائق سے روشناس کرانے کے لئے مسلسل تقاضے کر رہے ہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پاکستان کے اسکول اور کالج کے کسی نصاب کی کتاب میں بہادر یار جنگ کی سیرت پیش نہیں کی گئی ہے تاکہ پاکستان کی نوجوان نسل ان کی زندگی سے آشنا اور ان کے کارناموں سے باخبر ہوسکے۔ ۲۳ مارچ کا اجلاس کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر نہیں ہوسکتا تھا اگر بہادر یار جنگ کی جیسی معروف شخصیت اس وقت لاہور میں موجود نہ ہوتی جس نے آتش بار فضاؤں کو اپنی سحر آفرینی سے ایسی ٹھنڈک عطا کردی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس انتہائی کامیابی سے منعقد ہوا۔ جب بھی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا تذکرہ کیا جائیگا اور مسلم لیگ کی کامیابی کا ذکر ہوگا تو وہ تاریخ مکمل نہیں ہوگی جب تک کہ بہادر یار جنگ کے کارناموں کو سامنے نہیں لایا جائے گا اس لئے ضروری ہے کہ ہم بہادر یار جنگ کی سیرت کو نصاب تعلیم میں داخل کریں اور آنے والی نسل کو اس کے مطالعہ کی طرف متوجہ کریں ورنہ آنے والی نسل پاکستان کی پوری تاریخ سے ہمیشہ نابلد رہے گی۔

ماحول جس سرزمین میں بہادر یار جنگ کی نشو نما ہوئی اور جس ماحول میں ان کی شخصیت پروان چڑھی وہ خطۂ ارضی اردو زبان کی پیدائش اور اس کی ترویج و اشاعت کے لئے برصغیر میں ممتاز رہا ہے چودھویں صدی عیسوی میں جب محمد تغلق نے دارالحکومت دلی سے دیوگری منتقل کیا تو جنوبی ہند کی قسمت جاگ اٹھی ایسا محسوس ہوا کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی مرکزیت جنوبی ہند میں قائم کردی گئی۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ نے پیہم انقلاب پیدا کئے اور جنوبی ہند کی اہمیت ہر لمحہ فروغ پاتی رہی۔

ایک دور ایسا بھی آیا کہ جنوبی ہند میں بہمنی خاندان کی حکومت قائم ہوگئی جس خاندان کے بادشاہوں نے دلی کی حکومت سے کلی طور سے سیاسی تعلقات منقطع کر لئے اور خود مختار و آزاد ہو کر دکن پر اپنی تہذیب... یہ بھی ہوا کہ انھوں نے دلی کی سرکاری زبان کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور اپنی حکومت کی ایک... لگ... [illegible]

بنالی۔ دلّی کی حکومت کی سرکاری زبان فارسی تھی جنوبی ہند میں بہمنی حکومت کے بادشاہوں نے اپنی حکومت کی سرکاری زبان دکنی کو قرار دیا اس طرح اردو زبان پہلی دفعہ ایوان حکومت میں پہنچی اور اسے سرکاری کارندوں کے کندھوں پر پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں زبان اردو نے شاہانہ آب و تاب کے ساتھ ترقی کی۔

چودھویں صدی ہی میں اردو زبان جنوبی ہند کی حکومت کی سرکاری زبان تسلیم کرلی گئی اور اس دور کے بعد ہر دور میں ہر زبان پھولتی پھلتی رہی۔ اردو زبان کے ان ہی مرغزاروں میں بہادر یار جنگ کا لڑکپن اور ان کی جوانی ارتقا پذیر ہوئی۔ جس حکومت کی دفتری زبان اردو ہو اس ملک میں اردو کے مایہ ناز شاعر انشا پرداز، ادیب اور مقرر پیدا نہیں ہوں گے تو اور کہاں پیدا ہوں گے؟

مقامی ماحول اور اردو زبان

ہندوستان کا ہر صوبہ اردو زبان کی پیدائش کے متعلق دعویدار ہے کہ اردو اس کے یہاں پیدا ہوئی لیکن راقم الحروف کا دعویٰ ہے کہ اردو اسی جگہ پیدا ہوئی جہاں ہندی پیدا ہوئی۔ دلیل یہ ہے کہ مولوی عبدالحق بابائے اردو فرماتے ہیں کہ اردو زبان میں اسی فیصد الفاظ ہندی کے استعمال ہوتے ہیں اور بیس فیصد فارسی، عربی، ترکی زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں۔ اب اگر اسی فیصد الفاظ ہندی کے استعمال ہوتے ہیں تو گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جہاں ہندی پیدا ہوئی اسی جگہ اردو بھی پیدا ہوئی۔ ہندی زبان کے ماہرین دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندی بھوجپوری بھاشا سے پیدا ہوئی ہے اور اسی لئے ہندی زبان کا سب سے پہلا شاعر کبیر داس کو تسلیم کیا جاتا ہے جس نے بھوجپوری زبان میں شاعری کی ہے۔

اردو زبان مقامی پراکرتوں سے پیدا ہوئی ہے اس لئے ہر صوبہ کی مقامی اردو زبان متاثر ہے دکن کی اردو زبان مقامی پراکرتوں سے اثر پذیر ہے۔ جنوبی ہند میں چار پراکرتیں بولی جاتی ہیں۔ (۱) تامل (۲) تلیگو (۳) ملیالم (۴) کنڑی مقامی پراکرتوں کے اثرات دکن کی اردو زبان پر نمایاں ہیں۔ بہادر یار جنگ کو گھریلو ماحول میں دکنی زبان بولتے ہوئے لوگوں نے سنا ہوگا۔ اتنا بڑا فصیح البیان مقرر دیہاتی لوگوں اور کم سے کم پڑھے لکھے انسانوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کرنے کا عادی تھا جس اردو زبان پر مقامی پراکرتوں کا رنگ چڑھا ہوا ہے اسی طرح صوبہ بہار میں بھی سات پراکرتیں بولی جاتی ہیں مثلاً (۱) مگدھی (۲) بھوجپوری (۳) میتھلی (۴) سنتھالی (۵) پالی (۶) برج بھاشا اور (۷) بنگالی مقامی اردو زبان پر ان تمام پراکرتوں کے اثرات نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ پراکرتیں صوبہ بہار میں بولی جاتی ہیں اس کے بعد جنوبی ہند میں بولی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ بہار کی اردو زبان اور جنوبی ہند کی اردو زبان اپنی زرخیزی میں جواب نہیں رکھتی ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کی بہتات ہے جس کا مقابلہ ہندوستان کے کسی گوشے کی اردو زبان نہیں کر سکتی ہے۔ ایسے ماحول میں جو شاعر اور ادیب پیدا ہوں گے جو مقرر اور نثار جنم لیں گے ان کا مقابلہ بھی محال ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور بہادر یار جنگ

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "یاد رفتگاں" میں تحریر فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ حیدر آباد دکن

تشریف لے گئے تو حیدرآباد اسٹیشن پر ایک پندرہ سولہ سالہ نوجوان ان سے مصافحہ کے لئے آگے بڑھا۔ مصافحہ کرتے وقت اس جوان نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ وہ علامہ کا شاگرد ہے۔ علامہ کو اس کی گفتگو پر حیرت ہوئی۔ مولانا نے اس نوجوان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "تمھیں میں نے کبھی نہیں پڑھایا تم میرے شاگرد کس طرح ہو سکتے ہو" نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اس نے خطبات مدراس کو ازبر کرلیا ہے اس لئے وہ ان کا شاگرد ہے۔ یہی نوجوان کچھ عرصے کے بعد نواب بہادر یارجنگ کے روپ میں جلوہ گر ہوا۔

ایک نوجوان جس نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں خطبات مدراس حفظ کرلئے ہوں اس کے وجود میں سیرت رسول کے نقش و نگار کیوں نہ سرایت کرگئے ہوں گے اور اس کی ذات کو درخشانی عطا کردی۔ قرآن حکیم کو حفظ کرکے لوگ حافظ بن جاتے ہیں سیرت رسولؐ کو حفظ کرکے کیا عاشق رسولؐ بن جانا لازمی نہیں؟ بہادر یارجنگ کی فکری عظمت اور لسانی شخصیت کی بنیاد خطبات مدراس ہی کو قرار دینا ہوگا۔ وہ نوجوانی کے زمانے ہی سے میلادالنبی کے جلسوں کو مخاطب کیا کرتے تھے اور خطبات مدراس کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے تھے۔ نوجوان کی تقریر سننے ایک دنیا عشق حق کرتی تھی اس لئے کہ تقریر میں پختہ فکر کی لہریں موجزن ہوتی تھیں اور زبان و بیان میں فصاحت و بلاغت کا دریا امنڈ آتا تھا۔ سننے والوں کے تحسین و آفریں کے نعروں سے فضائے بسیط گونج اٹھتی تھی۔ سیرت رسولؐ کے مقرر کی حیثیت سے پندرہ سولہ سال کی عمر میں ان کی شہرت آسمان پر پہنچ گئی تھی۔ سیرت کے ایک نوجوان مقرر کی حیثیت سے ان کی پذیرائی ہونے لگی اس عمر میں سیرت پر ان جیسی تقریر کوئی دوسرا نوجوان نہیں کرسکتا تھا۔

خطبات | ایک ایسے محقق کی آٹھ تقریریں ہیں کہ جس نے سیرت کے مضامین کو پھیلایا تو سات جلدیں مرتب کردیں اور جب اسے سمیٹا تو آٹھ تقریروں میں سمو دیا۔ آٹھ تقریریں گویا سمندر کوزے میں بند ہے اب اگر کوئی نوجوان اسی سمندری کوزے کو گھٹے پر لئے پھیرے تو اس کی حیثیت کیا ہوگی؟ ماحول نے بہادر یارجنگ کو علم و فضل کا متاع گرانمایا عطا کردیا۔ اس نوعمری میں علم کی بہتات نے ان کی شخصیت کو اس طرح نکھار دیا کہ اس کی درخشانی کی تاب ناممکن ہوگئی۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کے فیض علم نے بہادر یارجنگ جیسی ہمہ گیر شخصیت کو جنم دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اگر علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم سے خطبات مدراس ترتیب نہ پاتے تو بہادر یارجنگ عصر حاضر کا لسان العصر مقرر نہیں قرار پاسکتے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے شہ پاروں نے ایک عظیم شخصیت کو عالم وجود میں لا بٹھایا اور اس کی زبان کو اپنے ادبی کمالات سے مرصع کرکے بے نظیر بنا دیا۔ آج بھی اگر کسی شخص کو بہادر یارجنگ کے مرتبہ کو حاصل کرنے کی آرزو ہے تو اسے خطبات مدراس حفظ کرنا ہوں گے۔

نواب عثمان علی خاں فرمانروائے سلطنت آصفیہ | حیدرآباد دکن کی سرزمین علم دوست کی حیثیت سے تاریخ [illegible]

معروف رہی ہے لیکن نواب عثمان علی خاں کا دور علمی فضیلت اور ادبی برتری کے تمام سابقہ ادوار پر سبقت لے گیا۔ علم دوست کی حیثیت سے نواب کی شخصیت تاریخ دکن میں نادر روزگار ہے۔ ہندوستان کی سرزمین سے اہل علم و دانش کو چن چن کر اپنی سلطنت میں مدعو کیا جو اس کی رونق میں اضافے کا باعث ہے۔ ہندوستان کی تمام چیدہ چیدہ شخصیتیں سلطنت آصفیہ کا طرۂ امتیاز قرار پائیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جامعہ عثمانیہ کا قیام اور دارالترجمہ کی تنظیم نظام دکن کا تاریخی کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم زبان اردو کو قرار دے کر نظام دکن نے اردو زبان کی ہمہ گیری اور اس کی عظمت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ تمام ہندوستان سے بے شمار ممتاز ادیب شاعر بے مثال نثار اور خطیب مدعو کئے گئے اور ان کو حیدرآباد بلایا گیا۔ اور مختلف مراکز علوم و فنون ان کے سپرد کر دیے۔ اس طرح سلطنت آصفیہ علم و ادب کا مرجع اور مخزن بن گئی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی

مولانا مناظر احسن گیلانی ان ہی ممتاز شخصیتوں میں سے ایک تھے جنھیں صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا اعلیٰ مقرر اور وقیع نثار تھے۔ سکندرآباد کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ اور عیدین کا خطبہ بھی دیتے تھے۔ بہادر یار جنگ کو مولانا سے بے انتہا عقیدت تھی وہ ان کی خدمت میں حاضری کو اپنے لیے سعادت گردانتے تھے۔ مولانا کی شخصیت سے کسب فیض کرنا بہادر یار جنگ کی عادت سی ہوگئی تھی۔ مولانا کے خطبوں میں شرکت بہادر یار جنگ کے لئے باعث خیر و برکت تھی اسی لئے ان کی صحبت سے استفادہ کرنا ان کا مقصود زندگی بن گیا تھا۔ عیدین کی نماز کے بعد مولانا کے دولت کدے پر حاضری بہادر یار جنگ کے لئے لازمی تھی اسی لئے ان کی پہلی نشست مولانا کے یہاں ہوتی تھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد مولانا کی کار کے پیچھے پیچھے بہادر جنگ کی گاڑی دکھائی دیتی تھی۔ مولانا کے حضور میں جب کھڑے ہوتے تو دست بستہ۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کی شخصیت بے مثال مصنف اور شعلہ بیاں مقرر کی تھی سرزمین پاک و ہند میں قلم برداشتہ لکھنے والا اتنا بڑا نثار آج تک دوسرا پیدا نہ ہو سکا۔ آپ کی شعلہ بیانی بھی اپنی مثال آپ تھی۔ تقریریں طوفان اٹھاتا تھا لہروں کا مدوجزر ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔ ہر جملہ انقلاب بدوش رہتا شخصیت کو منقلب کر دینے والا الفاظ و جملے سیلاب کی طرح رواں ہوتے۔ آواز میں بجلی کی کڑک تھی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں تھا۔ روانی کا یہ عالم کہ الفاظ سانچے میں ڈھلتے جاتے تھے۔ فکر کا تار بکھرتا نہیں تھا اور بیان اللہ اللہ سننے والوں کے دلوں کو مسخر کر لیتا تھا اسی لئے بہادر یار جنگ مولانا مناظر احسن گیلانی کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے تھے ان کے حضور میں حاضری کو باعث فخر جانتے تھے۔ ہمیشہ برملا اعتراف کرتے تھے کہ تقریر کا فن مولانا سے حاصل کیا اور ان کی شعلہ بیانی کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔

راقم الحروف اور عثمانیہ یونیورسٹی
سنہ ۱۹۴۰ء تا سنہ ۱۹۴۲ء

راقم الحروف نے ۱۹۳۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ۳۸-۱۹۳۷ء ۳۹-۱۹۳۸ء دو سال بی این کالج میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم رہا اسی دوران آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا۔ جس میں بھرپور حصہ لیا کالج کی تعلیم کے زمانے میں راقم الحروف کی آنکھ خراب ہوگئی اس لئے کچھ دنوں سے

لیے تعلیم کو ملتوی کر دینا پڑا۔ ۱۹۴۱ء میں راقم الحروف نے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کا رخ کیا۔ انٹرمیڈیٹ کلاس میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۲ء میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی بی اے کی تعلیم کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی روانہ ہو گیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں قیام کے دوران دو سال تک نواب بہادر یار جنگ سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی ہر تقریب میں طلبا برادری نواب بہادر یار جنگ کو شرکت کی دعوت دیتی تھی۔ مختلف اقامت گاہوں کی تقریبات میں بھی نواب صاحب شریک ہوتے تھے۔ راقم الحروف بی ہوسٹل میں رہتا تھا۔ نواب صاحب بی ہوسٹل کی متعدد تقریبات میں تشریف لاتے۔ جس تقریب میں نواب صاحب موجود ہوتے طلبہ برادری ان سے تقریر کی گذارش ضرور کرتی تھی۔ جامعہ کے سالانہ جلسے میں نواب صاحب ضرور تشریف لاتے تھے۔ ڈنر کے بعد ان کی تقریر لازمی ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد حاضرین نواب صاحب سے تقریر کی فرمائش کرتے تھے وہ اپنی اختتامی تقریر کے لیے طلبہ برادری میں خاص طور سے معروف تھے۔ بہادر یار جنگ اپنی تقریر میں لسانیات کا جوہر دکھاتے اور فکر و نظر کی بہاریں لٹاتے تھے۔ تقریر کیا ہوتی موتی رولتے تھے۔ سامعین ان کی تقریر سن کر جھوم اٹھتے مسرور اور متکیف ہو جاتے۔ کبھی کبھی ان کی گفتگو سے محفل کشت زار زعفران بن جاتی تھی۔

۱۹۴۱ء۔ راقم الحروف کی عمر کا بیش قیمت حصہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کا زمانہ ہے علم کی پیاس بجھانے کے لیے جامعہ میں بے شمار مراکز تھے۔ اقامت گاہوں میں لائبریری تھی جس میں ہزاروں کتابیں ہوتی تھیں۔ کتابیں آسانی سے دستیاب ہوتی تھیں اس لیے بے شمار کتابوں کے پڑھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ راقم الحروف سرما کی تعطیلات میں مولانا مناظر احسن گیلانی کے مکان پر قیام کرتا تھا۔ دن رات علامہ کی صحبت نصیب ہوتی تھی۔ تحریر و تقریر کا عجیب غریب ماحول رہتا تھا۔ مولانا تین بجے رات تک روزانہ قلم برداشتہ لکھتے رہتے تھے۔ مولانا آنکھیں بند کر کے گفتگو کرتے تھے۔ جب آنکھیں کھولتے تو ان کی آنکھیں لال لال مخمور نظر آتی تھیں جنہیں دیکھ کر انسان بہت متاثر ہوتا تھا۔ کبھی خوف بھی دامن گیر ہوتا۔ ایک سال عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد بہادر یار جنگ مولانا کے ساتھ [illegible] مولانا کے مکان پر تشریف لائے۔ سب لوگ فرش پر بیٹھ کر ناشتہ اور چائے نوش کرنے لگے۔ گفتگو ہونے لگی۔ بہادر یار جنگ نے فرمایا کہ یہ تو مولانا کا فیض ہے جو میری طاقت گفتار کو شہرت حاصل ہو گئی۔ بزم اقبال کے متعلق فرمایا کہ آج کل گھر پہ بزم اقبال ترتیب دی ہے ہفتے میں ایک نشست ہوتی ہے اور اقبالیات پر تبادلہ خیال۔ نواب صاحب اقبالیات کے بڑے دلدادہ تھے اقبال کے چند اشعار بھی پیش کیے اور معنی اور مطالب بھی بیان کیے مولانا نے مزید تائید طلب کی۔ ادبی گفتگو کے بعد سیاسی گفتگو ہونے لگی۔

مقامی مسلمانوں کی حکومت میں تناسب کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ حیدر آباد اسٹیٹ میں اصلاحات نافذ ہونے والا تھا مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر تناسب پر نواب صاحب کو اعتراض تھا جسے سر اکبر حیدری وزیر اعظم نے منظور کر لیا تھا۔ نواب صاحب دکن میں مسلم اقتدار کے حامی تھے اور مسلمانوں کی [illegible] یقین رکھتے تھے اسی موقع پر راقم الحروف نے سر علی امام کے نام کی طرف توجہ دلائی کہ حیدر آباد [illegible]

۱۹۱۰ء میں مسلم اقتدار کے قیام کے لیے عملی اقدامات کئے تھے لیکن سر اکبر حیدری اور ان کے ہم نواؤں نے سر علی امام کی اسکیم کو ناکامیاب بنانے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس پر نواب صاحب بہت ملول خاطر ہوئے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ سر علی امام کا نام نہ لیجئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بہت غمگین انداز میں گویا ہوئے کہ بے شک سر علی امام نے سلطنت آصفیہ میں مسلم اکثریت کے قیام کی کامیاب جد وجہد کی ابتدا کی تھی اگر اس وقت ان کی اسکیم کو سراہا جاتا اور مسلمانانِ حیدرآباد سر علی امام کی تجویز کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کرتے تو آج جو خطرہ حیدرآباد اسٹیٹ کے وجود کو لاحق ہو گیا ہے وہ کبھی نہ ہوتا۔ ہائے افسوس لوگوں نے سر علی امام کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے حیدرآباد اسٹیٹ کو بچانے کی اس وقت کوشش کی جب کوئی اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مولانا آزاد سبحانی کا تذکرہ

مولانا آزاد سبحانی کے متعلق فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ اتحاد المسلمین حیدرآباد کے جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ وقت مقررہ پر رضاکاروں کو اسٹیشن روانہ کیا مولانا کی ہیئت کذائی کچھ ایسی تھی کہ رضاکار شناخت نہ کرسکے اور واپس چلے آئے۔ ابھی جلسہ شروع ہی ہونے والا تھا کہ مولانا پنڈال میں نمودار ہوئے۔ گرد سے اٹے ہوئے خستہ حال، عجب درویش صفت بزرگ تھے۔ مولانا آزاد سبحانی کا تعارف جلسے میں کرایا اور بتایا کہ آج برصغیر میں اگر کوئی شخص حضرت ابوذر کے رنگ میں رنگا ہوا ہے تو دیکھو وہ تمہارے سامنے ہے۔ بہادر یار جنگ مولانا آزاد سبحانی کو ایک بے نظیر شخصیت تسلیم کرتے تھے۔

بہادر یار جنگ کو بہادر یار جنگ بنانے میں دو شخصیتیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک کی تحریر نے بہادر یار جنگ کو فکر و نظر عطا کی اور دوسرے کی تقریر نے زبان و بیان۔ اس کے بعد بہادر یار جنگ بن گئے۔ ایک عظیم شخصیت، ایک بے مثال قائد، ایک بلند قامت انسان، ایک نادر روزگار نواب۔

دسمبر ۱۹۳۸ء آل انڈیا مسلم لیگ پٹنہ سیشن

آل انڈیا مسلم لیگ پٹنہ سیشن اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت ہی تاریخی اجلاس تسلیم کیا جاتا ہے۔ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد یہ پہلا عوامی اجلاس تھا جس نے مسلمانانِ ہندوستان کی اجتماعی قوت کی دھاک بٹھا دی۔ اس اجلاس کا حسن و جمال تہذیب و شائستگی، رعب و جلال کی مثال نہیں۔ اس اجلاس نے ہندوستان کے ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کا رعب ڈال دیا۔ اس اجلاس میں دو باتیں انتہائی تاریخی اہمیت کی ظہور پذیر ہوئیں جنھیں عزیز ملت سید عبدالعزیز کی فکری کاوشوں کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پٹنہ کے اجلاس نے مسٹر جناح کو قائد اعظم بنا دیا۔
۲۔ نواب بہادر یار جنگ کو آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا۔

قائد اعظم

مسٹر جناح کے لئے قائد اعظم کے الفاظ کسی صحافی نے اپنے اخبار میں قلمبند کئے تھے لیکن اس کی وجہ سے ان کو شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ پٹنہ سیشن میں عزیز ملت سید عبدالعزیز نے سب سے پہلی دفعہ ایک سیاسی پلیٹ فارم سے بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ مسٹر جناح کو قائد اعظم کے الفاظ سے مخاطب کیا تو ان الفاظ کو پر لگ گئے۔ صوبے

اجلاس میں عزیز ملت نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور مسٹر جناح کو قائد اعظم کے الفاظ سے مخاطب کیا اس کے بعد یہ الفاظ زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ شام کے اجلاس میں پنجاب کا ایک رضاکار نعرہ زن ہوا اس کے بعد اس خطاب کو شہرت دوام حاصل ہو گئی۔ راقم الحروف مندوبین کی نشست میں بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا

آل انڈیا مسلم لیگ پٹنہ سشن کا سہ روزہ اجلاس جب ختم ہوا تو چوتھے دن عزیز ملت سید عبد العزیز نے نواب بہادر یار جنگ کے موقف کی تائید کے لئے ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا۔ یہ اجلاس بھی اسی پنڈال میں منعقد ہوا جہاں مسلم لیگ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس اجلاس میں قائد اعظم نے شرکت نہیں کی تھی اس لیے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی دیسی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کی نہیں تھی۔ اس اجلاس کی صدارت وزیر اعلیٰ سرحد جناب اورنگ زیب خان صاحب نے فرمائی تھی اس اجلاس میں نواب بہادر یار جنگ کی تقریر حیدر آباد حکومت کے آئینی اصلاحات کے سلسلے میں ہوئی۔ انھوں نے سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر آباد اسٹیٹ کے اصلاحات کی مخالفت کی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نشستیں دی گئی تھیں نواب بہادر یار جنگ مسلمانوں کے پچاس فیصد نشستوں سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا موقف تھا کہ مسلمانان حیدر آباد حکمراں کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے انھیں ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ نشستیں دی جائیں۔ وہ بار بار اپنی تقریر میں فرماتے تھے کہ حیدر آباد کی حکومت میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تسلیم کیا جائے اس لئے کہ وہ دراز سے اس سرزمین پر حکمراں ہیں۔ اس اجلاس میں آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور نواب بہادر یار جنگ کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ بہادر یار جنگ پہلے مجلس اتحاد المسلمین کے صدر تھے پٹنہ سشن نے انھیں برصغیر کی تمام ریاستوں کا صدر بنا دیا اب ان کی ذات گرامی برصغیر کی ایک عظیم شخصیت بن کر ابھری۔

قرآن

(خطبات قائد ملت مرتبہ نذیر الدین احمد مطبوعہ حیدر آباد دکن)

کیا یہ حقیقت نہیں ہے اور کیا اس سے انکار کر سکتا ہے کہ خدائے علیم و حکیم نے نزول قرآن کیلئے سب سے زیادہ بنجر زمین اور سب سے زیادہ جاہل قوم کا انتخاب کیا۔ کیا خدا کو اس رسالت کبریٰ کو پہنچانے کیلئے کوئی عالم فاضل منطقی اور فلسفی نہیں مل سکتا تھا، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے نبی آئے عموماً علوم دینی سے نابلد تھے اور خصوصاً اس کا آخری پیغام لانے والا (صلی اللہ علیہ وسلم) لوح و قلم سے بے نیاز کر کے پیدا کیا گیا تھا اور خود قرآن نے اس کے امی ہونے کی شہادت دی ہے کیا مکہ کے مزدور و مدینہ کے مزارع، گھروں کی عورتیں، صحرا و دشت کے بدو، دامن کوہ کے وحشی اپنی ساری جہالتوں اور بے عقلیوں کے ساتھ مسجد نبوی کے صحن میں جمع نہیں ہوتے تھے اور زبان محمد سے اس واحد و یکتا خدا کی آیتیں سن کر اپنے قلب و دماغ کی کہنہ اور نسلی گندگیوں سے پاک نہ ہو جاتے تھے اور پھر کیا وہی جاہل وہی امی فلسفہ و منطق سے لا علم رہتے ہوئے عالم قرآن ہو گئے۔

میں یہ کہتا ہوں قرآن ابر باراں اور چشمۂ آفتاب کی طرح خدا کی ایک رحمت عام ہے۔ اس سے ہر شخص بقدر ظرف متمتع کر سکتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے پیالے قدح و زمشان خم و دریچل کی سر مستیاں دیکھ کر یوں مایوس ہوتے ہیں اور لوگ آپ کو قرآن کے بادۂ عرفان سے کیوں محروم سمجھتے ہیں ہم مسلمانوں پر واجب ہے کہ قرآن اور اس کے جتنے متعلقہ علوم ہیں ان سب کو سیکھنے کی کوشش کریں اور قرآن کو اس طرح سمجھیں جس طرح اس کو سمجھنے کا حق ہے۔

(مکاتیب بہادر یار جنگ)

[illegible] سید [illegible] مبلغ [illegible] محمد خلیل [illegible]

پروفیسر محمد اسلم

میں نے نواب بہادر یار جنگ کو دیکھا

دسمبر ۱۹۴۳ء کے اواخر میں کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اکتیسواں سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ اُس زمانے میں راقم الحروف کے والد مرحوم بسلسلۂ ملازمت لاہور میں مقیم تھے۔ ہمارے آبائی وطن پھلور (ضلع جالندھر) سے پندرہ سولہ افراد ایک جماعت کی صورت میں لاہور آئے۔ ان میں میرے جدّ امجد حاجی عمرالدین اور عمِ مکرم حاجی محمد اقبال بھی شامل تھے۔ لاہور سے ہم کراچی روانہ ہوئے۔ اسی زمانے میں سکنڈ کلاس کا سفر لگژری سمجھا جاتا تھا۔ والد مرحوم اور جدِ امجد مغفور کو ریلوے کے فری پاس ملتے تھے، اس لئے ہم تینوں ایک ہی ڈبہ میں سوار ہوئے۔ حُسنِ اتفاق سے میاں عبدالباری مرحوم بھی جو قیامِ پاکستان کے بعد پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تھے، اسی ڈبہ میں سفر کر رہے تھے۔ میاں صاحب حقّہ کے بڑے رسیا تھے، چنانچہ سکنڈ کلاس کے ڈبے میں بھی ان کا حقّہ گرم رہا۔ کبھی کبھی میاں صاحب حقّے کی نَے میرے جدِ امجد کی طرف موڑ دیتے، تو وہ بھی کش لگا لیتے۔

ایک شب و روز ساتھ رہنے سے میں میاں صاحب سے مانوس ہو گیا۔ جب ہم کراچی کے قریب پہنچے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ایک کاغذ پر تبرکاً کچھ لکھ دیں۔ میاں صاحب نے اپنا بریف کیس کھولا اور ایک کاغذ پر یہ عبارت لکھ کر میرے حوالے کی :-

Life is to give, not to take.

میں یہ تحریر لے کر بہت خوش ہوا، لیکن اس کا مطلب اس وقت میری سمجھ میں نہ آیا۔

کراچی کینٹ پہنچ کر ہم ٹرین سے اُترے اور سٹیشن سے قریب ہی ریلوے کالونی میں قیام پذیر ہو گئے۔ ہم ایک باورچی ساتھ لے گئے تھے جو پوری جماعت کا ناشتہ اور کھانا تیار کرتا، اس لئے وہاں قیام میں بڑی سہولت رہی۔

اگلے روز شام کو لی مارکیٹ سے مسلم لیگ کا ایک جلوس نکلنا تھا جو پوری شان و شوکت کے ساتھ جلسہ گاہ تک جانا تھا۔ جلوس کے راستے کو رنگ برنگی جھنڈیوں، سوت کے پھولوں اور خوبصورت کپڑوں سے سجایا گیا تھا۔ راستے میں جابجا آرائشی دروازے بنائے گئے تھے جو مختلف شخصیتوں کے نام سے منسوب کئے گئے تھے۔ ہمیں تیمپر روڈ پر کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ شام کو نمازِ عصر کے بعد جلوس کا آغاز ہوا۔ نیشنل گارڈز اور خاکساروں کے دستے مارچ پاسٹ کرتے ہوئے گزرے۔ لوگوں نے تالیوں اور نعروں کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ سب سے آخر میں ایک اونٹ گاڑی آئی،

جسے اکتیس[۳۱] اونٹ کھینچ رہے تھے۔ اس گاڑی کو بڑی مہارت کے ساتھ پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ گاڑی کے دونوں جانب پھول اس سلیقے سے لگائے گئے تھے کہ ۔ پاکستان کا ناخدا ۔ پڑھا جاتا تھا۔ گاڑی پر پھولوں سے لدی ہوئی ایک بڑی سی چھتری کے نیچے قائداعظم ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ کراچی کی فضا قائداعظم زندہ باد اور " لے کے رہیں گے پاکستان " کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ جلوس آہستہ آہستہ چلتا ہوا، بلکہ رینگتا ہوا، جلسہ گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پنڈال سے باہر ایک بہت بڑا دروازہ بنایا گیا جس پر "باب السلام" لکھا ہوا تھا۔ قائداعظم وہاں پہنچ کر گاڑی سے اترے اور انھوں نے باب پر اپنے ہاتھوں سے مسلم لیگ کا پرچم لہرایا۔ اس وقت ہجوم کا جوش قابل دید تھا۔ پرچم کشائی کے بعد قائداعظم نے اردو میں مختصر تقریر کی۔ مجھے بزرگوں نے بتایا کہ انھوں نے مسلم لیگ کے کئی جلسوں میں شرکت کی ہے لیکن قائداعظم کی زبان سے پہلی بار اردو میں تقریر سنی ہے۔

پرچم کشائی کے بعد افتتاحی جلسہ شروع ہوا۔ میرے بزرگ ڈیلی گیٹ تھے، میں اپنی کم عمری کی وجہ سے ڈیلی گیٹ بن سکتا تھا لیکن اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس صورت میں مجھے کہاں بٹھایا جائے؟ چنانچہ کافی لے دے کے لئے مجھے بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ بیٹھنے کے لئے کرسی مل گئی۔ اگلے روز نیشنل گارڈ کے ایک رضاکار کے اعتراض پر یہ فیصلہ ہوا کہ میں وہ بیج اپنے کوٹ پر لگانے کی بجائے جیب میں رکھوں پھر میرے وہاں بیٹھنے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

سٹیج پر مسلم لیگ کے عمائدین، خان لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر، غلام حسین ہدایت اللہ، آئی، آئی چندریگر، خواجہ ناظم الدین، نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ، چودھری خلیق الزماں اور نواب بہادر یار جنگ تشریف فرما تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ قائداعظم نے انگریزی زبان میں تقریباً گھنٹہ بھر تقریر کی۔ حاضرین میں میری طرح بہت سے لوگ انگریزی سے نابلد تھے، اس لئے جونہی قائداعظم نے تقریر ختم کی، حاضرین جلسہ نے اردو ترجمہ اردو ترجمہ اور بہادر یار جنگ کی رٹ لگانی شروع کر دی۔ قائداعظم نے مسکراتے ہوئے نواب صاحب کی طرف دیکھا اور وہ مسکراتے ہوئے ڈائس پر تشریف لائے۔

میرے خیال میں اس وقت سٹیج پر جتنے عمائدین موجود تھے، ان میں قد و قامت کے اعتبار سے نواب بہادر یار جنگ منفرد تھے۔ انھوں نے براؤن رنگ کی دھاریدار اچکن اور چوڑیدار پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ اس وقت وہ ننگے سر تھے یا اُن کے سر پر حیدرآبادی وضع کی سفید رنگ کی ٹوپی تھی۔ ان کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی نورانی داڑھی بڑی خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے جب قائداعظم کی انگریزی تقریر کا ترجمہ شروع کیا تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سامعین کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ ان کی تقریر میں دکن کے پانچ دریاؤں نربدا، تاپتی، مہاندی، کرشنا اور کاویری کی طرح روانی تھی، الفاظ و معانی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایسی فصیح و بلیغ تقریر میں نے نہ اس سے پہلے کبھی سنی تھی اور نہ ہی اس کے بعد کبھی سننے کا اتفاق ہوا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ انھوں نے قائداعظم کی تقریر کے ایک فقرہ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا تھا، "اُن کے گھر کی ڈیوڑھی کی چوکھٹ کے سامنے کی سڑک کے آخری کنارے پر"۔ اس پر سامعین نے تحسین کے ڈونگرے برسائے۔ نواب صاحب کو یوں داد ملتی دیکھ کر قائداعظم اور ان کے رفقاء بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ نواب صاحب

بعد اور بھی کئی مقرر ڈائس پر آئے۔ ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

ان کے بعد کسی مقرر کا رنگ نہ جم سکا۔ نواب صاحب جلسہ لوٹ چکے تھے اور ان کی تقریر سن کر ہر شخص دل و جان سے ان کا معتقد بن چکا تھا۔

یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ میں نے نواب بہادر یار جنگ کو دیکھا اور انہیں سنا۔ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کی وفات کی خبر سنی تو مجھے بیحد ملال ہوا۔ اس وقت ہر شخص یہی کہہ رہا تھا کہ اگر وہ زندہ رہتے تو بلاشبہ وہی قائد اعظم کے جانشین ہوتے۔

غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہی اصل حقایق سے واقف ہے۔ ہمیں یہ پتہ چلا تھا کہ اپنی مقبولیت کی بنا پر نواب بہادر یار جنگ ریاستی سیاست اور درباری سازش کا شکار ہو گئے۔ ان کے حاسدین نے انھیں ایک دعوت میں بلایا۔ کھانے کے بعد حسب عادت حقہ طلب کیا۔ بس حقہ نوش کرنا تھا کہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ خون کی قے ہوئی اور نواب صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس بات کا شبہ کیا جاتا ہے کہ انھیں تمباکو میں زہر ملا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس شبہ کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ جب ان کے اعزا و احباب نے ان کے خون آلود کپڑے کیمیکل تجزیہ کیلئے بمبئی یا مدراس بھیجنے کا مطالبہ کیا تو حیدر آباد کے سیاسی اور انتظامی حلقوں میں اس کی مخالفت کی گئی اور کسی مقامی پیتھالوجسٹ سے ہی تجزیہ کرانے کا فیصلہ کیا تاکہ صحیح رپورٹ عوام کے سامنے نہ آسکے۔

نواب بہادر یار جنگ کے آباد اجداد مہدی جونپوری کے پیرو کار تھے۔ اس لئے نواب موصوف کی تربیت بھی ایک مہدوی کی طرح کی گئی تھی۔ وہ مسلم لیگ میں شامل ہونیکے بعد بھی کافی عرصہ تک مہدوی رہے۔ اجلاس کے دوران میں جب ان کے ساتھی نماز ادا کرتے، تو نواب صاحب اپنے عقیدے کے مطابق ان کے ساتھ جماعت میں شریک نہ ہوتے اور الگ سے نماز پڑھتے۔ اسی زمانے میں موصوف حج کے لیے گئے۔ تو وہاں حرم شریف میں بھی جماعت میں شرکت سے احتراز کرتے رہے۔

ایک بار ان کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ کیسی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک طرف تو وہ اتحاد المسلمین کے صدر بنے ہوئے ہیں اور دوسری جانب ان کی یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز بھی ادا نہیں کرتے۔ اس بات کے ذہن میں آتے ہی ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو گیا اور انہوں نے عام مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز با جماعت شروع کر دی۔ ایک روز ان کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ حج کے موقعہ پر عام مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے تھے اسلئے ان کا حج قبول نہیں ہوا۔ چنانچہ موصوف دوبارہ حج کو گئے اور عام مسلمانوں کے ساتھ مل کر مناسک حج ادا کیے۔

مسلم لیگی رہنماؤں کی صف میں نواب بہادر یار جنگ اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے بڑی قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ انکی دینداری ان کی شکل سے ظاہر ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص حلفیہ یہ کہے کہ ان کے بعد ان سا متدین رہنما برعظیم میں پیدا نہیں ہوا، تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ ان کا چہرہ دیکھ کر سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود کی تفسیر آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔ وہ خلوص و ایثار کا پیکر تھے۔ انھوں نے ایکبار جس چیز کو حق سمجھ لیا اس کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی جاگیر اور خطاب عطائے تو بہ لقائے تو کہتے ہوئے واپس کر دیئے لیکن شہنشاہی استعمار کے آگے سر نہیں جھکایا۔ حضور سرور کائنات ؐ کے ساتھ انھیں ایک گونہ عقیدت تھی اور جب وہ سیرت کے جلسہ میں تقریر کرتے تو خود بھی روتے اور سامعین کو بھی رلاتے۔ ان کا شمار برعظیم کے گنے چنے مقررین میں ہوتا تھا۔ جس نے ایکبار ان کی تقریر سن لی، پھر وہ کسی مقرر کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

———

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

ملّتِ اسلامیہ کا مخلص رہنما

نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے جدِ اعلیٰ محمد دولت خاں احمد شاہ درانی کی یورشوں کے زمانے میں ہندوستان آئے اور ریاست جے پور کے ایک چھوٹے سے قصبے پورا بارٹ میں مقیم ہوئے اور اپنی کارگزاری کے صلے میں راجا سے کچھ جاگیر پائی۔ محمد دولت خاں کا تعلق پٹھانوں کے مشہور قبیلے سدوزئی سے تھا۔

۱۸۲۰ء میں اس خاندان نے ریاست جے پور کو خیرباد کہہ کر جنوب کی طرف رُخ کیا اور نواب سکندر جاہ بہادر کے عہد میں یہ خاندان حیدرآباد دکن میں پہنچا۔ محمد دولت خاں نے اپنے سپاہیانہ اوصاف اور شجاعت و تہوری کی بدولت دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ دولت خاں اور ان کے صاحبزادے محمد نصیب کی کوششوں اور جانفشانیوں سے ریاست میں بد امنی کا قلع قمع ہو گیا۔ ان کی ان خدمات کو نظام کے یہاں درجۂ قبولیت حاصل ہوا۔ اور صوبہ برار میں چار لاکھ کی جاگیر عنایت ہوئی۔ دولت خاں کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے محمد نصیب خاں نے اپنی خاندانی روایات کو حسبِ معمول برقرار رکھا جس کے نتیجے میں وہ مزید جاگیر اور انعامات سے سرفراز ہوئے۔ محمد نصیب خاں کے جانشین ان کے اکلوتے بھتیجے محمد دولت خاں (ثانی) قرار پائے۔ اور محمد دولت خاں ثانی کے جانشین ان کے لائق فرزند محمد نصیب خاں (دوم) ہوئے۔ یہی محمد نصیب خاں، نواب محمد بہادر خاں (نواب بہادر یار جنگ مرحوم) کے والد ماجد ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ ۳ر فروری ۱۹۰۵ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ اور مفید الانام (حیدرآباد دکن) میں ہوئی۔ کچھ دنوں مدرسہ دار العلوم بلدہ میں بھی تعلیم حاصل کی۔ نواب بہادر یار جنگ طالب علمی کے زمانے میں ایک اوسط درجے کے طالب علم تھے مگر کسے معلوم تھا کہ یہی اوسط درجے کا طالب کل برصغیر ہند و پاکستان کا ایک بڑا مدبر، اعلیٰ ترین خطیب اور بے مثل قائد ہوگا۔ ابھی میٹرک کے امتحان کی تکمیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے مدرسہ کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مگر ذاتی اور خانگی طور پر تعلیم جاری رہی علوم اسلامیہ تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی باقاعدہ تحصیل کی، تاریخ و سیرت پر خاص توجہ کی اور ان علوم میں درک حاصل کیا۔ مولوی سعادت اللہ خاں اور مولوی سعید اشرف شمسی ان کے اساتذہ میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ کی والدہ کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا نانی نے بڑی توجہ سے پرورش و تربیت فرمائی۔

دم کو اپنے آبائی فنون حرب وسپاہ گری سے بہت تعلق تھا چنانچہ لٹھ چلانے شمشیر زنی، نشانہ اور بیراکی کی خاص طور سے مشق کی۔ ب بہادر یار جنگ کی عمر ۱۸ سال کی ہوگی کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے تقریباً پانچ لاکھ کا قرضہ چھوڑا۔ ب بہادر یار جنگ نے بڑی ہمت، استقلال اور پامردی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ اور اپنے حسن تدبر و تدبیر اور کارپردازی آٹھ سال میں تمام قرض ادا کر دیا۔ اور جاگیر کے حالات بہتر بنائے۔

نواب بہادر یار جنگ اسلام کے سچے فدائی اور متبع کتاب وسنت تھے۔ انھوں نے داڑھی کبھی نہیں منڈوائی۔ شادی موقع پر انھوں نے ایسی جرأت اور استقلال دکھایا کہ سب لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ غرض احترام سنت کا ان کو بہت س تھا۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم مذہبی جذبے سے سرشار تھے ۱۹۳۱ء میں ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ حج بیت اللہ لیے تشریف لے گئے۔ حیدر آباد کے حجاج کے قافلہ سالار تھے۔ اس موقعے پر والی حجاز اور والیٔ افغانستان سے اتیں ہوئیں۔ نواب بہادر یار جنگ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے فارغ ہو کر ممالک اسلامیہ کے سفر پر روانہ ئے۔ قافلے کے دوسرے لوگ واپس آگئے۔

نواب بہادر یار جنگ نے ممالک اسلامیہ کا مسلسل سفر کیا اور چھ ماہ میں عراق، شام، فلسطین، مصر، ترکی، وسط یا، ایران، افغانستان، وغیرہ ممالک کو بڑے غور سے دیکھا، ہر ملک کے علما، اہل سیاست اور دوسرے سربرآوردہ اہل الرائے حضرات سے ملاقاتیں کیں۔ مسلمانوں کے حالات کا بڑے غور سے جائزہ لیا۔ نواب مرحوم نے ہر جگہ اپنے ے اثرات چھوڑے۔

ممالک اسلامیہ کی سیاحت سے مسلمانوں کی پستی، بے راہ روی، اندھی قیادت و تقلید ان کی خود ناشناسی اور خدا شناسی کے گہرے نقوش نواب بہادر جنگ کے قلب پر مرتسم ہوئے۔ نواب مرحوم نے ۱۹۲۷ء میں ایک مجلس "انجمن تبلیغ اسلام" م سے قائم کی۔ مسلسل تین سال تک مملکت حیدر آباد کے دیہات و قریات و قصبات کے دورے کیے۔ ان کو اس کام میں بہت سی توں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے اپنا کام جاری رکھا خدا نے کامیابی عطا فرمائی کہتے ہیں کہ تقریباً پانچ ر غیر مسلم نواب بہادر جنگ کے دست حق پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس انجمن کے ذریعے بحیثیت مجموعی تقریباً بیس ہزار غیر مسلم قہ بگوش اسلام ہوئے، نواب مرحوم نے اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ تبلیغ اسلام کے مصارف کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ں ہندوستان کے دوسرے امرا۔ اور اہل ثروت بھی اس ذوق سے آشنا ہوتے تو نتائج کتنے شاندار نکلتے۔

نواب بہادر یار جنگ سراپا پیکر عمل تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمان عیش و عشرت اور بے عملی میں پڑ گئے ہیں ان کی عسکری قوت ہو چکی ہے نواب مرحوم عسکریت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے آریہ سماجیوں اور ہندوؤں کی عسکری تنظیم آر۔ ایس۔ ۔ ایس (راشٹریہ سویم سیوک سنگھ) کے مقابلہ میں خاکسار تحریک کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اس میں عملی طور سے شرکت کی، اس کے ضبط و تنظیم کی اسی طرح پابندی کی جس طرح ایک عام رکن کرتا ہے۔ لیکن بعد میں نواب بہادر یار جنگ اس تحریک حدہ ہو گئے۔ نواب مرحوم نے اس کی تلافی جماعت رضا کاران سے کی اور اس کی تنظیم کے تحت ہر تھانے، قصبے اور ضلع میں نی ورزش اور عسکری تعلیم کے مراکز قائم کیے۔

۱۹۲۲ء میں آریہ سماج کی شدھی سنگٹھن تحریک نے ریاست حیدر آباد کو اپنی تخریبی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ایک انتشار کی کیفیت پیدا کر دی بعض عاقبت اندیش اور دور بین حضرات نے اتحاد المسلمین کے نام سے ایک جماعت اس سیلاب کی روک تھام کے لیے قائم کی، نواب بہادر یار جنگ نے اس انجمن کی تائید کی اور اس کے استحکام میں پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔ جب کانگریس کی طرف سے جمہوریت کے نفاذ کے پردے میں مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں، تو نواب بہادر یار جنگ نے بڑی پامردی سے حالات کا مقابلہ کیا اور جب حیدر آباد کی حیثیت ختم کرنے کے لئے وفاق کا مسئلہ سامنے آیا تو اس وقت بھی اس مرد مجاہد نے تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی مضرت کو ظاہر کر کے دم لیا۔

نواب بہادر یار جنگ نے جب دیکھا کہ کانگریس نے ریاستوں میں دخل اندازی کرنے کے لئے اسٹیٹ کانگریس کا ڈھونگ رچایا ہے تو انھوں نے آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی کیونکہ مسلم لیگ کا دائرہ عمل صرف برطانوی ہند تک محدود تھا اسٹیٹ مسلم لیگ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور درخت بن گئی ریاستی مسلمانوں کے علاوہ برطانوی ہند کے مسلمانوں نے بھی اس کی خدمات کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا غرض کہ بہادر یار جنگ مرحوم کی بصیرت و سیاست کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے

نواب بہادر یار جنگ مرحوم قربانی اور ایثار کا مجسمہ تھے نواب مرحوم نے جاگیر اور خطاب اپنی مرضی سے واپس کیا وجہ یہ ہوئی کہ نظام دکن کا فرمان جاری ہوا کہ منصب دار اور جاگیردار ملازم سرکار متصور ہوگا اور ملازم سرکار کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہے، نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا کہ یا تو وہ جاگیر و خطاب کو سنبھالیں یا مسلمانوں کی سیاسی خدمات انجام دیتے۔ اس پیکر ایثار و عمل اور مرد مجاہد نے جاگیر و خطاب کو ٹھکرا دیا اور خدمت خلق کو مقصد حیات قرار دیا۔

نواب بہادر یار جنگ اقلیم خطابت کے بادشاہ تھے ان کی تقریر جادو اور سحر کا کام کرتی تھی ہزاروں لاکھوں کے مجمع کو جس سمت چاہتے موڑ دیتے ان کی خطابت کے دوست اور دشمن سبھی معترف تھے۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم ملت اسلامیہ کے مخلص رہنما اور اسلام کے سچے فرزند تھے مسلمانوں کی تکلیف و مصیبت سے دل پھٹ جاتا اور کلیجہ شق ہو جاتا۔ سچے عاشق رسول تھے عشق رسول ان کا سرمایہ حیات تھا ان کا قول اور فعل متبع سنت ہوتا تھا۔ قرآن کے عاشق اور شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے کلام کے شیدائی تھے۔

۲۵ جون ۱۹۴۴ء کا وہ دن ہے کہ نواب بہادر یار جنگ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور ان کی بے تاب روح ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو گئی۔

ذخیرہ پاکستان کے عظیم مبلغ

نواب بہادر یار جنگ

از میر [illegible] حاجی گورنمنٹ اردو کالج

شعبہ [illegible] کراچی

پروفیسر شریف المجاہد

نواب بہادر یار جنگ

تدبیر اور فراست کا پیکر

نواب بہادر یار جنگ کے انتقال پر قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے تعزیت نامہ میں کہا کہ "وہ اپنے قلب اور روح کی گہرائیوں سے ایک سچے مسلمان تھے"۔ قائد کے یہ الفاظ دراصل حیدر آباد دکن کی اس عظیم ہستی کے طرزِ عمل ۔ افکار و اعمال اور خدمات کا ایک پرخلوص اعتراف ہیں ۔ ایک شاہی ریاست سے وابستہ ہونے کے باوجود مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر ایک ممتاز مقام حاصل کر لینا دراصل بہادر یار جنگ کی اعلیٰ سیاسی صلاحیتوں اور بے مثال عقل و دانش کی ایک روشن دلیل ہے ۔ وہ پورے برصغیر میں اپنی ان صلاحیتوں اور فہم و فراست کی بنیاد پر اس قدر جلد مقبول ہو گئے تھے کہ ۲۵ جون [illegible] کو جب اُن کا انتقال ہوا تو متحدہ ہندوستان میں کہرام مچ گیا ۔ ہر شہر اور قریہ [illegible] عظیم پریشانی اور غم کا اظہار کیا گیا ۔

نواب بہادر یار جنگ کی انتقال کے وقت صرف انتالیس (۳۹) برس کی عمر تھی ۔ وہ بینی پٹھانوں کے ایک گھرانے میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے ۔ بینی پٹھان ۱۸ ویں صدی کے وسط میں احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے ۔ یہ لوگ پہلے "جے پور" کی ایک بستی میں سکونت پذیر ہوئے اور انیسویں صدی کے وسط میں یعنی سکندر جاہ کے دورِ حکومت میں حیدر آباد دکن چلے آئے ۔ جہاں مرہٹوں کے ساتھ جنگوں کے دوران نمایاں عسکری خدمات انجام دینے پر اِن کو جاگیریں اور خطابات عطا کیے گئے ۔

نواب بہادر یار جنگ کا نام بہادر خان تھا ۔ سات سال کی عمر میں والدہ نے اور اٹھارہ سال کی عمر میں والد نے داغ مفارقت دیا جس کے نتیجہ میں آبائی جاگیر کا انتظام و انصرام آپ کے ذمہ آگیا ۔ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی کیونکہ آپ کے والد تقریباً ۵ لاکھ روپے کے مقروض تھے اور اس قرض کی ادائیگی بھی آپ کو ہی کرنا تھی چنانچہ آپ نے ان فرائض کو [illegible] سلوبی کے ساتھ انجام دینے کا فیصلہ کیا اور آٹھ سال کی طویل مدت میں نہ صرف انھوں نے قرض کی ادائیگی کر دی بلکہ جاگیر کے انتظامات کو چار چاند لگا دیئے ۔ نواب بہادر یار جنگ کی ابتدائی زندگی کا

ایک ایسا باب ہے جس سے اُن کی شخصیت میں پوشیدہ تمام جوہر کھل کر سامنے آ گئے اور ریاست میں اُن کے تدبر و فراست کی دھوم مچ گئی۔

۲۶ سال کی عمر میں آپ حج بیت اللہ کی نیت سے نکلے اور اس اہم مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے بعد مشرق وسطیٰ اور افغانستان کا دورہ کیا نتیجتاً آپ کو عالم اسلام کے مسلمانوں کے مسائل سے آگاہی حاصل ہوئی مشرق وسطیٰ میں آپ نے مصطفےٰ نحاس پاشا، محمد علی پاشا، مفتیٔ اعظم الحاج امین الحسینی سے ملاقات کی اور اُن شخصیات سے آپ کے اسقدر مستحکم تعلقات قائم ہوئے کہ برسوں خط و کتابت جاری رہی۔ نواب بہادر یار جنگ کے دل میں عالم اسلام اور مسلمانوں کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ ہر وقت مسلمانوں کو اُن کے مسائل سے نجات دلانے کی فکر میں منہمک رہتے تھے مشرق وسطیٰ کے رہنماؤں کے ساتھ اُن کی خط و کتابت کا موضوع بھی مسلمانوں کو اُن کی موجودہ بدحالی سے نجات دلانے کی راہ دریافت کرنے سے متعلق ہوا کرتا تھا۔

نواب بہادر یار جنگ نے ۱۹۲۰ء کے آواخر میں خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات طیبہ پر خطبات کا سلسلہ شروع کیا آپ کے یہ خطبات عوام و خواص میں بے حد مقبول ہوئے۔ یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا حتیٰ کہ ۱۹۳۰ء میں نظام حیدر آباد دکن نے آپ کا ایک خطبہ سُن کر آپ کی اسلام کے بارے میں گہری معلومات اور خطیبانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بہادر یار جنگ کا خطاب دیا۔ نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور اطراف و اکناف سے ہزاروں دعوت نامے آپ کو موصول ہوتے۔ آپ کا انداز خطابت ایک سحر لئے ہوئے تھا۔ آپ گھنٹوں بولتے اور سامعین سکتہ کے عالم میں سُنتے رہتے۔ تیسرے اور چوتھے عشرہ کے اوائل میں جن افراد کو نواب صاحب کی تقاریر سُننے کا موقع ملا ہے وہ میری طرح اِن خطابات کی سحر آفرینی سے تادمِ مرگ نکل نہیں سکتے۔ روح پرور تقاریر کو سُن کر یہ احساس ہوتا تھا کہ ایک مخصوص عارفانہ کیفیت میں بول رہے ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ کچھ عرصہ علامہ عنایت اللہ مشرقی کی قائم کردہ تنظیم خاکسار تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں خاکساروں پر فائرنگ اور پنجاب میں اس تنظیم پر پابندی کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال میں بھی آپ کی اس تنظیم سے وابستگی اور حمایت برقرار رہی۔ قائد اعظم محمد علی جناح پر ایک خاکسار کی جانب سے بزدلانہ قاتلانہ حملہ کے بعد نومبر ۱۹۴۳ء میں آپ کو یہ احساس ہوا کہ علامہ مشرقی کی حکمت عملی مسلمانوں کے درمیان استحکام پیدا کرنے کے بجائے اختلافات کا موجب ثابت ہو رہی ہے چنانچہ اس تنظیم سے علیحدگی اختیار کر لی۔

۱۹۳۰ء کے اواخر میں بہادر یار جنگ اپنی قائدانہ صلاحیتوں کی بنا پر محمد علی جناح کی نظروں میں آ چکے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے اور اُن کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے مشکل کام میں مصروف تھے۔ محمد علی جناح چونکہ اردو میں تقریر نہیں کر پاتے تھے اس لئے اُن کو ایک ایسے باصلاحیت شخص کی ضرورت تھی جو مسلم لیگ کے پیغام کو برصغیر کے دور دراز شہروں اور قصبوں تک پہنچا سکے۔

نواب بہادر یار جنگ ایک ایسے رہنما تھے جو اس کام کو باآسانی کر سکتے تھے چنانچہ محمد علی جناح کی نظر انتخاب آپ پر پڑی اور جن لوگوں نے نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر سنی ہیں وہ اس امر کی گواہی دیں گے کہ نواب بہادر یار جنگ محمد علی جناح کی اس پسند کی مکمل تفسیر تھے۔

بہادر یار جنگ کو ریاست کا باشندہ ہونے کی وجہ سے کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس وغیرہ میں کسی طرح کی آئینی یا کوئی واضح حیثیت حاصل نہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ لیگ کے نظریات کی تشہیر اور ۱۹۴۰ء سے مسلمانوں کی مطالبۂ پاکستان کی توضیح کے لئے ہمیشہ لیگ کے اجلاس میں موجود رہتے تھے۔

مسلم لیگ اور پاکستان کے قیام کے سلسلہ میں نواب بہادر یار جنگ کی خدمات درحقیقت انتہائی عظیم ہیں۔ یہ آپ کی آواز کا جادو تھا جس نے لاکھوں مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع کر دیا۔ ۱۹۳۸ اور ۱۹۴۴ کے دوران مسلم حلقوں کے ضمنی انتخابات میں آپ نے نہایت پر اثر تقاریر کیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۳ میں شمال مغربی سرحدی صوبہ کے ضمنی انتخابات میں لیگ کی شاندار کامیابی کا سہرہ آپ کے سر ہے۔ سرحد کا یہ دورہ آپ نے سردار اورنگ زیب خاں کے نام محمد علی جناح کا ایک خط پڑھنے کے بعد کیا تھا جس میں جناح نے قاتلانہ حملہ کے بعد اورنگ زیب خاں کو لکھا تھا کہ "میرے زخم اُس وقت تک مندمل نہیں ہوں گے جب تک سرحد میں مسلم لیگ کامیاب نہیں ہو جائے گی۔"

۱۹۴۰ء میں مشتعل خاکساروں کو قابو کرنے کے سلسلہ میں آپ کی خلیبانہ صلاحیتوں کا بڑا دخل تھا واضح رہے کہ لیگ اجلاس لاہور ۱۹۴۰ کے انعقاد سے چند دن قبل پولیس کی زیادتیوں کے جواب میں خاکسار حکومت پنجاب سے متصادم ہو گئے تھے۔ انھوں نے ایک طرح کی سول نافرمانی کا آغاز کر دیا تھا صورت حال روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ لیگ کا اجلاس ملتوی ہونے کی باتیں ہونے لگیں لیکن بہادر یار جنگ اس قسم کی کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں تھے چنانچہ انھوں نے مشتعل خاکساروں کو ہموار کرنے اور لیگ کے اس تاریخی اجلاس کو جس میں قرار داد پاکستان منظور کی جانے والی تھی منعقد کرانے کے لئے فضا سازگار کرنے کی اہم ذمہ داری قبول کی۔

نواب بہادر یار جنگ نے حیدر آباد سے اپنی عوامی زندگی کا آغاز کیا۔ حیدر آباد میں آریہ سماجیوں کی سرگرمیوں کا انسداد کرنے کے لئے آپ نے ۱۹۲۷ء میں مجلس تبلیغ اسلام کا سنگ بنیاد رکھا اور ایک تبلیغی جماعت قائم کی اور پانچ ہزار افراد کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے ان کے بلا واسطہ اثرات کے نتیجہ میں تقریباً بیس ہزار افراد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دوئم یہ کہ انھوں نے جیسا کہ قبل کہا گیا ہے خاکسار تحریک میں شمولیت اختیار کر کے اسے حیدر آباد میں منظم کیا۔ سوئم یہ کہ تیسرے عشرہ کے اواخر میں مجلس اتحاد المسلمین میں شامل ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں اس کے صدر ہونے کے بعد اس کو عوامی سطح پر منظم کرنے کی ذمہ داری قبول کی اور آخر میں انھوں نے کل ہند ریاستی مسلم لیگ قائم کی۔ یہ غالباً

مسلم ہندوستان کے لیے ان کی عظیم ترین خدمات تھیں کیونکہ مسلم لیگ کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ ہندوستانی ریاستوں کے مسلمان مسلم لیگ کی سیاست اور پالیسیوں سے وابستہ اور آگاہ ہوئے۔

علاوہ ازیں ریاستی مسلم لیگ نے متعدد ریاستوں میں ان کے جائز حقوق بشمول ان کی زبان اور ثقافت کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی۔ صرف بہادر یار جنگ کی جان توڑ کوششوں اور دوروں کے نتیجہ میں یہ تنظیم ریاستوں کے مسلمانوں میں اسی طرح مقبول ہوئی جس طرح ہندوؤں میں کانگریس مقبول تھی اور مسلم لیگ کے اجلاسوں کے ساتھ کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے اجلاس بھی منعقد ہونے لگے۔

نظام کی حکومت بہادر یار جنگ کی سرگرمیوں سے خوش نہیں تھی۔ حیدر آباد کے مسلمانوں پر ان کے جو شدید اثرات تھے نظام اس کی وجہ سے محتاط ہو گیا تھا۔ اسے اس کا احساس ہو گیا تھا کہ مسلمان قیادت اور تحریک کے لئے نظام کے محل کنگ کوٹھی کے بجائے بہادر یار جنگ کی رہائش گاہ بیدوی منزل کا رخ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ نظام نے ان کی سرگرمیوں کا سدِ باب کرنے کے لئے ایک فرمان جاری کر کے جاگیرداروں کے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی تھی۔

اس فرمان کے خلاف بہادر یار جنگ کا جواب انتہائی خصوصیت کا حامل تھا۔ سیاست کو ترک کرنے کے بجائے انھوں نے جاگیر اور خطابات واپس کرنے کو ترجیح دی حالانکہ یہ قدم ان کے لئے مالی مشکلات پیدا کرنے والا تھا۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے اور زندگی کی آخری سانسوں تک وہ بے باک اور بے خوف رہے۔ انھوں نے پھر نظام کی حمایت کرنے کی کوشش خواہ بلاواسطہ ہی کیوں نہ ہو، کبھی نہیں کی۔ اس طرح آپ پہلے مسلم لیگی تھے جو سیاسی مقصد کے تحت اپنے خطابات اور جاگیر سے دست بردار ہوئے جبکہ مسلم لیگ کے دیگر ارکان نے قائد اعظم کی ہدایت پر ۱۹۴۶ء میں یہ قدم اٹھایا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا موازنہ اکثر جذبات سے پر خلافت تحریک کے بے باک رہنما مولانا محمد علی سے کیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر کی طرح وہ بھی انتہائی جذباتی مسلمان تھے اور وہ سب سے پہلے اسلام اور صرف اسلام کے وفادار تھے۔ بہادر یار جنگ نے خواہ خاکسار تحریک میں شرکت اختیار کی ہو اتحاد المسلمین میں، خواہ انھوں نے آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ قائم کی ہو یا مسلم لیگ کے امور میں نمایاں حصہ لیا ہو۔ انھوں نے ان تمام سرگرمیوں میں صرف اس لئے حصہ لیا کہ یہ تنظیمیں مسلمانوں کو ان کے زوال اور تباہی کا احساس دلا کر ان میں بیداری پیدا کرنے کے کام میں مصروف ہیں۔

محمد علی جوہر کی طرح بہادر یار جنگ نے قرآنی تعلیمات کے فروغ کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا۔ اپنے مکان کے نزدیک واقع ایک مسجد میں وہ روزانہ اس کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کو ایک دفعہ قران ختم کرنے پر چھ سال کا عرصہ لگتا تھا۔ اس کے بعد وہ پھر از سر نو اس کو شروع کیا کرتے تھے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کسی مسلم رہنما کے ذہن میں آئینِ پاکستان کے خطوط آنے سے بہت پہلے

جب

آپ اسلامی آئین پر غور کر چکے تھے۔ ان کے خیال میں پاکستان کو صرف مسلم اکثریت کا ملک نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ایک ایسا ملک ہو جہاں مسلمانوں کو قرآن اور سنت کے احکامات کے مطابق اپنی زندگی سنوارنے کا موقع ملے۔" ۱۹۴۳ء میں انھوں نے کراچی میں منعقدہ لیگ کے اجلاس میں کہا تھا " اگر پاکستان کے سیاسی نظام میں قرآن کی حیثیت تحریک کے منبع کی نہ ہو تو میں اسے صرف ایک سراب کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار دے سکتا" انھوں نے جب یہ الفاظ ادا کئے تو قائد اعظم نے جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے میز بجا کر کہا " آپ سو فیصدی درست کہہ رہے ہیں "

مولانا محمد علی جوہر کی طرح بہادر یار جنگ انتہائی زبردست مقرر تھے۔ پہلی مرتبہ علی گڑھ کے مشہور اسٹریچی ہال میں آپ نے جب تقریر کی آپ تین بجے سہ پہر تک تقریر کرتے رہے لیکن سامعین کو ذرا بھی کوفت یا بے چینی کا احساس نہیں ہوا۔ لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد (۱۹۴۲ء) میں جب بہادر یار جنگ نے فنڈ کی اپیل کی تو ایک لاکھ پچیس ہزار روپئے اسی جگہ فوراً جمع ہو گئے۔ دہلی میں بھی لیگ کے اجلاس (۱۹۴۳) میں فنڈ کے لئے آپ کی اپیل کا یہی اثر ہوا تھا اور لاہور میں جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں انھوں نے اشتعال انگیزی پر آمادہ مشتعل خاکساروں کو تنہا قابو میں کر لیا تھا۔

ایک بے غرض اور بے لوث رہنما ہونے کے باوجود حیدر آباد اور دوسری جگہوں پر بہادر یار جنگ کے متعدد دشمن تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ سازش اور بغض و فساد کا شکار ہو گئے اور حیدر آباد میں ان کی سیاسی تقریروں پر پابندی عائد کر دی گئی۔

ان کی موت بھی بہت مشتبہ حالات میں ہوئی اور عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ ان کا حقہ زہر آلود کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ پورے برصغیر کے مسلمانوں میں ان خبروں سے اشتعال پھیل گیا لیکن کوئی باقاعدہ تحقیق نہیں کی گئی اور نہ ہی اتحاد المسلمین نے اس وقت تک ان کی موت کی تحقیق کا مطالبہ کیا جب تک سید قاسم رضوی اس کے صدر نہ ہوئے۔

پورے مسلم ہندوستان میں ان کی موت کا سوگ منایا گیا اور تحریک پاکستان خصوصاً ۴۶-۱۹۴۵ء کے عام انتخابات کے دوران جبکہ مسلم ہندوستان کی قسمت معلق تھی، ان کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی گئی۔

نظریہ پاکستان کے عظیم مبلغ

نواب بہادر یار جنگ

ڈاکٹر پروفیسر محمد خلیل ارشد پرنسپل وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔ شعبہ تصنیف و تالیف

یاں محمد سعید

مردِ مومن

بیسویں صدی میں عالم اسلام کی قیادت کے اُفق پر نمودار ہونے والی شخصیات میں برصغیر کے رہنماؤں کو بہت شہرت
ل ہے ۔ برصغیر پاک، ہند میں مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم اور جدوجہد آزادی کی تحریک میں جن قائدین نے عزم و استقلال ع
م کی قیادت سنبھالی ان کی تعداد حوصلہ افزا ہے ۔ ان میں بیشتر حضرات نے اپنے مزاج اور دائرہ عمل کے لحاظ سے زندگی کے مخصوص
بوں میں راہنمائی کی۔ لیکن ہمارے صفِ اوّل کے قائدین میں چند شخصیات ایسی بھی ہوئی ہیں جو مجمع الصفات ہونے کے
وصف ملت کو کامل راہنمائی دیکر صراطِ مستقیم پر گامزن کر گئیں ۔ نواب بہادر یار جنگ، اسی سرمایۂ افتخار جماعت کے رکن رکین ہیں۔

حیدر آباد دکن کے ایک متمول جاگیردار نواب نصیب یار جنگ ثانی کے گھر میں ۳ر فروری ۱۹۰۵ء کو آنکھ کھولنے
الے اس نوابزادے (محمد بہادر خاں) کی عمر ہنوز سات یوم تھی کہ والدہ داغ مفارقت دے گئیں۔ نانی اماں کی آغوش
فقت میں پرورش پائی ۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ اور مفید الانام میں حاصل کرنے کے بعد مدرسہ دار العلوم بلدہ میں
خل ہوئے ۔ ابھی میٹرک نہیں کر پائے تھے کہ والدِ محترم بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ موروثی جاگیرات ۔ جن کا سلسلہ بہت
یع تھا اس لئے انتظام و انصرام سنبھالنے کے لئے دار العلوم کو خیر باد کہنا پڑا ۔ ان ناموافق حالات میں نشوونما پانے والے محمد
در خاں کے متعلق کون قیاس کر سکتا تھا کہ اسے مستقبل قریب میں مسلمانانِ وطن کی علمی و سیاسی قیادت کا شرف حاصل ہوگا۔

نواب صاحب نے اپنی مختصر زندگی میں علمی ۔ تبلیغی ۔ اصلاحی ۔ سیاسی اور عسکری میدانوں میں بڑا نمایاں کردار
ا کیا۔ کسی زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھیں، موصوف ایک معتمد راہنما اور انسانِ کامل نظر آتے ہیں۔ ایک "مردِ مومن" کی حیثیت
سے ان کی زندگی بڑی روشن ہے۔ علم و ادب اور فروغِ دین سے گہرا قلبی لگاؤ تھا۔ محلاتی شان و شوکت سے بھرپور ماحو
ل میں پرورش پائی لیکن اس کے باوجود دیندارانہ ذہن ورثہ میں ملا تھا ۔ زمانۂ طالب علمی میں ہی شعائر اسلام کا اہتمام کرنے لگے تھے۔
سا اوقات ہم سبق نوابزادوں کی طعن و تضحیک کا نشانہ بنے لیکن پائے استقلال میں لچک نہیں آنے دی ۔ والد کی وفات
ے درسی تعلیم میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے جید علماء سے ذاتی طور پر اکتساب علم کر کے پورا کیا ۔ چنانچہ ان کے اساتذہ میں
ولوی سعد اللہ خاں سدوزئی اور مولوی سید اشرف شمسی جیسے مشاہیر کے نام شامل ہیں ۔ عربی ادب ۔ تفسیر ۔ حدیث
ور فقہ میں اساتذہ سے دستگاہ حاصل کی ۔ ذاتی کتب خانہ میں مستند و نایاب کتابوں کی وافر تعداد موجود تھی ۔ اس
ذانہ سے سالہا سال تک عمیق مطالعہ و تحقیق کے ذریعے فیضیاب ہوتے رہے۔

نواب صاحب کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں قرآنِ حکیم اور تاریخ اسلام سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان موضوعات پر اتنا عبور حاصل تھا کہ مہدوی منزل کی مسجد میں باقاعدہ درسِ قرآن دیتے تھے۔ اس مبارک مجلس میں طالبانِ حق کی کثیر تعداد حاضر ہوتی تھی۔ نواب صاحب کا دلنشیں اندازِ بیاں اور جذبات انگیز طرزِ خطابت سامعین کے دلوں کو گرماتا اور آنکھوں کو اشکبار کر دیتا تھا۔ دوسری نشست مہدوی منزل کی ڈیوڑھی "بیت الامت" میں ہوتی تھی جس میں تاریخ اسلام پر تحقیقی لیکچر دیتے تھے۔ یہ لیکچر بھی وسیع معلومات اور محققانہ تنقیحات کا انمول خزانہ ہوتے تھے۔ تدریس و ارشاد کی ان مجالس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اتحادِ ملی اور اصلاح و تعمیر کے لئے بھی بڑے ٹھوس عملی اقدام کئے۔ ۱۹۲۷ء میں "مجلس انجمن تبلیغ اسلام" قائم کی۔ اسی طرح تنظیمی مقاصد کو بروئے کار لانے کی خاطر "اتحاد بین المسلمین" کو "مجلس اتحاد المسلمین" کی صورت دی اور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک صدر کی حیثیت سے اس تحریک کو بڑی کامیابی کے ساتھ جاری رکھا۔ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قائد اعظم اور تحریکِ پاکستان کے حق میں جو بے مثل کارنامے انجام دئے وہ سینۂ تاریخ پر سنہری حروف میں درخشاں ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ کی زندگی کا سب سے نمایاں اور قابلِ رشک پہلو اُن کا "عشقِ رسول" ہے۔ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۱ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تو دربارِ نبیؐ میں حاضری کے دوران جس عقیدت، احترام اور فدایت کا مظاہرہ ہوا وہ ان کے "فرماں بردارِ رسولؐ" ہونے پر شاہد ہے۔ خطۂ حیدر آباد اور گرد و پیش میں میلاد النبیؐ اور سیرت النبیؐ کی مجالس میں انھوں نے جس شعلہ نوا اور رقت انگیز طرزِ خطابت کی بنا ڈالی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ محمد بہادر خاں سے نواب بہادر یار جنگ بہادر بن جانے کا ایمان افروز واقعہ بھی اسی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جناب صمدانی نقوی نے اس واقعہ کو قلمبند کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"یہ کیسی مبارک بات ہے کہ ناآشنایانِ حق کو حق آشنا کرنے والی اور مردہ قلوب میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے والی نواب کی سحر آفریں خطابت کا آغاز میلاد النبی کی محفلوں سے ہوا۔ گویا زبانِ فیض ترجمان ایک عطیہ تھا جو بارگہِ ختمی مرتبتؐ سے انھیں ارزانی کیا گیا تھا۔ ایک محفلِ میلاد کا واقعہ ہے کہ حیاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ منیر جاری تھا۔ دورانِ تقریر، خسروِ دکن نظام الملک آصفجاہ سابع محفل میں شرکت کی غرض سے چلے آئے۔ نواب مرحوم نے اپنے موضوع کو وہیں سے بدلا اور بادشاہِ وقت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"محمدؐ عربی کے اے تخت نشین و تاج پوش غلام! آ، میں تجھے بتاؤں کہ اس شہنشاہِ کونینؐ تخاطب کی نظر میں اندازِ ملوکیت کیا تھے"

اور تخاطب کے ساتھ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ طیبہ کا یہ مخصوص پہلو حیطۂ بیان میں آیا اور خطابت کے اعجاز نے اس قدر دلنشیں بنایا کہ آصفجاہ سابع میر عثمان علی خاں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ بار بار ہاتھ زانو پر مارتے جاتے اور تقریر کے جملوں کو بار بار دہرانے کی فرمائش کرتے۔ محفلِ میلاد جب اختتام کو پہنچی تو نواب مرحوم نے بادشاہ کو درباری انداز سے سلام پیش کیا۔ نظام اس درجہ متاثر تھے کہ چند لمحوں کے لئے خموشی نے جیسے

گویائی کو مسلوب کر لیا تھا اور الفاظ جیسے اظہار کے لئے مہمل نظر آنے لگے تھے۔ پھر بہادر کے خطاب سے اعزاز بخشا۔"

حضرت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کا اظہار نواب صاحب کی مشہور نعت سے بخوبی ہوتا ہے جس کا مطلع ہے:۔

اے کہ ترے وجود پر خالقِ دوجہاں کو ناز اے کہ ترا وجود ہے، وجہ وجودِ کائنات

اس نعت کا مقطع ہے:۔

مجھ سے بیاں ہو کس طرح رفعتِ شانِ احمدی تنگ مرے تصورات، پست مرے تخیلات

اس نعت میں ایک قادر الکلام شاعر کی طرح عقیدت کے پھول بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن ایک عالم اور ایک شاعر کا فرق مندرجہ ذیل شعر سے بخوبی نمایاں ہو رہا ہے۔

اے کہ تری زبان سے ربِّ قدیر گل فشاں وحیٔ خدائے لم یزل، تھی تری ایک ایک بات

اس میں قرآن حکیم کی سورۃ النجم کی ترجمانی بڑے دل نشین انداز سے کی گئی ہے۔ حیات مستعار کے آخری ایام میں مولانا محمد علی پروفیسر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"میری منزل مسلمان کو منفرداً اور جماعتِ اسلامیہ کو مجتمعاً منہاج نبوت پر دیکھنا ہے — میرا عمل، میری مجلس کی قرار دادیں اور میری تقاریر اس اجمال کی تفصیل ہیں۔ گو ہمتِ عالی کے نزدیک یہ منزل بھی ایک سنگِ میل ہے اور حقیقی منزل تاج خلافتِ الٰہیہ کا زیب سر کرنا اور فرشتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھنا ہو سکتا ہے، لیکن میں ان سب کو اپنے نصب العین کے لازمی نتائج تصور کرتا ہوں۔ جس طرح آگ سے لازماً گرمی ملتی ہے۔ اسی طرح طریقِ مصطفوی کا سالک بے کھٹکے انتم الاعلون کا مخاطب ہو جاتا ہے۔ امت وسط بن جاتا ہے، خیر امت ہو جاتا ہے، ہم انا جعلنا کم خلائف فی الارض کا مصداق قرار پاتا ہے۔" [1]

ان اقتباسات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ نواب بہادر یار جنگ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق محض جذباتیت و عقیدت کی حد تک نہیں تھا بلکہ ان کے سامنے قرآنی نظام خلافت اور اسوۂ رسول کا بڑا واضح دستور العمل موجود تھا جس پر وہ خود گامزن تھے اور پوری ملت کو اسی صراطِ مستقیم پر لانے کی جد و جہد کر رہے تھے۔ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کی تحریک آزادی اور قیام پاکستان کے لئے ان کی تگ و دو کا مقصد بھی یہی تھا۔ چنانچہ مذکور الصدر خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں "مسلم لیگ کے ساتھ اسی لئے ہوں کہ غیر شعوری طور پر اس کا قائد اسی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ پاکستان کے دستور حکومت کی تحریک اس سال کے اجلاس میں نہ آسکی اور مجلس موضوعات نے اس کو قبل از وقت اور خلافِ مصلحت قرار دیا۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشی

---

[1] مکاتیب بہادر یار جنگ صفحہ ۴۳ [2] حیات بہادر یار جنگ صفحہ ۱۵

خوشی ہوئی کہ اس مقصد کو مقصدِ حیات سمجھنے والوں کا ایک خاصا بڑا گروہ لیگ میں پیدا ہو گیا اور آپ حیران ہوں گے کہ یہ سب کے سب دیوانے داڑھی منڈے اور اصطلاحاً غیر عالم ہیں۔ ان کی مایوسی سے دل کو رنج ہوا۔ آخری اجلاس کی آخری تقریر میری بادہ گوئیاں تھیں۔ اس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث رہی اور لیگ کے پلیٹ فارم سے اللہ نے میری زبان سے اعلان کروایا کہ پاکستان کا دستور الٰہی دستور اور وہاں کی حکومت قرآنی حکومت ہوگی۔ اور سب سے بڑھ کر قابلِ مسرت یہ کہ جب میں دورانِ تقریر اس مقام پر پہنچا تو قائدِ اعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مکا مار کر فرمایا۔ تم بالکل درست کہتے ہو، اور میں نے فوراً اعلان کر دیا کہ قائدِ اعظم سے میرے قول پر سند تصدیق مل گئی ہے۔"

کاش یہ مردِ مومن اپنے آفاقی مشن کو پاکستان کی صورت میں متشکل ہوتے دیکھ سکتا۔ قیامِ پاکستان کے وقت اور دستوری مہم کے ابتدائی مراحل میں بہادر یار جنگ موجود ہوتے تو پاک وطن کی تاریخ قرونِ اولیٰ کے نظامِ خلافت سے عبارت ہو سکتی تھی۔ لیکن مصلحتِ خداوندی تک عقلِ ناقص کی رسائی ہے نہ تقدیرِ الٰہی سے انسانِ ناتواں کو تاب قرار۔

موضوع کا حق ادا نہیں ہوتا اگر شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے ساتھ نواب بہادر کے تعلقِ خاطر کا ذکر نہ کیا جائے۔ حیدرآباد میں نواب صاحب کی مجالس میں "درسِ قرآن" اور "تاریخِ اسلام" کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ ایک خصوصی نشست "مجلسِ اقبال" یا "حلقۂ اقبال" کے نام سے بڑی باقاعدگی سے منعقد کی جاتی تھی۔ اس میں اہلِ ذوق احباب کو مدعو کیا جاتا تھا اور نواب صاحب کلامِ اقبال کی تشریح کرتے تھے۔ علامہ اقبال ۱۸۷۷-۱۹۳۸ اور نواب بہادر یار جنگ ۱۹۰۵-۴۴ء کو بجا طور پر ہم عصر کہا جا سکتا ہے۔ ان کے عقائد، نظریات اور نصب العین میں بڑی نمایاں یکسانی موجود تھی۔ حلقۂ اقبال کے انعقاد سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب صاحب کلامِ اقبال سے متاثر بھی تھے اور اس کی اشاعت کو اپنے مشن کے لئے ضروری سمجھتے تھے کوئی وجہ نہیں کہ ان دونوں ہستیوں کے مابین براہِ راست تعلق یا مراسلت نہ رہی ہو۔ شیخ عطاء اللہ صاحب ایم اے (شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو اپنے مکتوب (۲۸۲) میں خود لکھتے ہیں کہ "مکاتیبِ اقبال کا آپ سے زیادہ میں خود متلاشی ہوں۔ اپنے کاغذات کا ایک ایک پرچہ تلاش کیا لیکن افسوس ہے کہ وہ مطلق ہاتھ نہ آیا۔ کم از کم میں اس طرف سے مایوسی ہو چکا ہوں اور آپ کو کسی انتظار مزید میں رکھنا نہیں چاہتا۔" اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے تحریر کردہ خطوط نہیں مل سکے تھے۔ لیکن جو مکاتیب نواب صاحب نے خود لکھے تھے ان کی نقل تو بیاض میں محفوظ تھی۔ افسوس ہے کہ "مکاتیبِ بہادر یار جنگ" میں ایسا کوئی مکتوب شامل نہیں پایا گیا۔ اس کوتاہی نے بڑی تشنگی پیدا کر دی ہے۔ امید ہے بہادر یار جنگ اکادمی کے اربابِ اختیار آئندہ اشاعتوں میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

کلامِ اقبال کی روشنی میں نواب بہادر یار جنگ کی عظمتِ کردار کا جائزہ لیا جائے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا "شاہین"، "مردِ مومن"، "مردِ قلندر" اور "بندۂ مسلماں" محمد بہادر خان کے قالب میں تشکیل پا رہا ہے۔ عبدالستار خاں ... حمید نظامی، محمد حبیب اللہ اور سید ابوالبرکات کے نام لکھے گئے خطوط اس عزم و آرزو کی غمازی کرتے ہیں۔ بعض دوستوں کو گمان ہوا ہے کہ ان کا باہمی ربط ہم ذوق مفکرین ہونے کی وجہ سے یا ہم سخنی کے باعث

رہا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اقبال اور بہادر کا اصل رابطہ "اطاعتِ خدا اور عشقِ رسول ؐ" کی رسّی سے بندھا ہوا ہے۔ اقبال نے فنا فی اللہ ہو کر مقام خودی پر فائز ہونے کی جو آرزو کی تھی اس کا حاصل بہادر یار جنگ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ اور اقبال نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع و محبت سے سرشار ہو کر "محبوب خدا" بن جانے کا جو راستہ یاد دلایا تھا، بہادر یار جنگ نے اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ دونوں کا فکری ارتکاز توحید اور رسالتِ محمدیہ ؐ کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔

بے شک اقبال نے "گفتار کا غازی" بن کے دل موہ لئے تھے۔ لیکن جس "کردار کے غازی" مسلمان کی ان کو آرزو تھی اس کی بڑی ایمان افروز جھلک بہادر یار جنگ کی زندگی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس مردِ مومن کی سوانح حیات کا نچوڑ ایک شعر میں بیان کرنا ہو تو اس مقصد کو:۔

اسی کشمکش میں گزریں مِری زندگی کی راتیں ۔۔۔ کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

کے مفہوم میں سمویا جا سکتا ہے۔ حیاتِ مومن کا جو تصور اقبال کے ذہن میں تھا اس کے مختلف پہلو کلامِ اقبال میں ملتے ہیں۔ ان میں سے کسی حصہ کلام کا مطالعۂ حیاتِ بہادر کو سامنے رکھ کے کیا جائے، معلوم ہوتا ہے کہ متکلم کے حیطۂ خیال میں یہی پیکرِ صدق و صفا موجود تھا۔ اقبال کہتا ہے:۔

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے ۔۔۔ رمید از سینۂ اُو سوزِ آہے

دِلش نالد چرا نالد نہ داند ۔۔۔ نگاہے یا رسول ؐ اللہ نگاہے

بہادر یار جنگ موروثی طور پر نواب اور نوابزادہ ہونے کے علاوہ دربارِ آصفیہ میں اونچے مرتبہ و مقام کے حامل تھے لیکن ان کی طرزِ زندگی میں فقر و درویشی کی شان از مہد تا لحد نمایاں رہی۔ ان کی مجالس و محافل اور تقریر سے سوزِ دروں کے چشمے پھوٹتے تھے۔ خوشحالی و فارغ البالی سے ہم کنار اور محبوب خلائق ہونے کے باوجود ملت کی ابتری اور مستقبل کے نامعلوم اندیشوں سے قلبِ حزیں سے نالہ و فریاد جاری رہتے تو دربارِ رسالت سے راہنمائی کی بھیک مانگتے۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر ۔۔۔ تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

کتاب و سنّت پر قوم کو مجتمع کرنے اور غلامی کی زنجیریں کاٹنے کو مقصدِ حیات بنایا ہوا تھا۔ اس پر آشوب راہ میں آلام و ابتلا کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ ماحول سے ٹکراؤ ہوا اور اربابِ اقتدار کے تیور بدلے۔ بہادر یار جنگ نے اپنے ہادی ؐ کے اسوۂ مبارک سے راہنمائی حاصل کی اور تاج آصفیہ کی عطا کردہ مراعات و اعزازات واپس کر کے قصرِ سلطانی سے نجات حاصل کر لی تاکہ اپنی صراطِ مستقیم پر قائم رہ کر منزل تک پہنچ سکیں۔

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں ۔۔۔ مجھے ہے حکمِ اذاں، لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

بیسویں صدی کا نصفِ اوّل مسلمانوں کی فکری کم مائیگی۔ معاشی بدحالی۔ سیاسی ابتری اور اخلاقی افلاس کا بدترین نمونہ تھا۔ انفرادی کردار سے لے کر اجتماعی اقتدار تک ہر جگہ مایوسی و بے راہ روی کا دور تھا۔ نفسا نفسی کے اس عالم میں مسلمان دنیاوی اغراض اور مالی مفاد کے لئے ہر آستانے پر ناصیہ فرسائی کر رہے تھے

تنظیموں اور تحریکوں سے نواب بہادر یار جنگ خود وابستہ تھے ان میں بھی اس قماش کے مفاد پرستوں کی کمی نہ تھی۔ طاغوتی طاقتوں سے ہر قدم پر بہادر یار جنگ نے پوری جرأت کے ساتھ ٹکر لی۔ مصلحتِ وقت یا ذاتی مفاد کی خاطر انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ بلکہ ہر قدم پر طاغوت سے مقابلہ کیا اور ہر بت خانے میں صدائے حق کو بلند کیا۔

اقبال کی وفات کے چھ سال بعد اقبال کا یہ "مردِ مومن" بھی اپنے جہادِ زندگی کی مجسم تعبیر دیکھے بغیر اپنے رب سے دور واصل بحق ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

ملّت کی زبان

دارالعلوم حاضر ہوا۔ مقابلہ کے میدان میں مقابلے والے اتر رہے، میٹرک کلاس کے طلبہ جیسی تقریر کر سکتے ہیں عموماً ان میں کی تقریروں کا حیا لبس اسی قدر تھا، آخر میں اس جوڑے جسم چکلے سینے کے ساتھ "بہادر خان طالب علم" بھی آگے بڑھے، تقریر شروع ہوئی لیکن پہلا دوسرا، تیسرا لفظ اس بھاری بھرکم فربہ جسم والی زبان سے نکل کر ابھی شاید کوئی فقرہ بھی نہ بننے پایا تھا کہ توقع کی گذشتہ سطح میں ہلچل پیدا ہوئی، کان کھڑے ہو گئے، دماغ چوکنا ہو کر بیدار ہو گیا، دل اٹھ بیٹھا، میں کیا سن رہا ہوں؟ کیسے سن رہا ہوں؟ "دکن کے مطلع سے خطابت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے" ایسا معلوم ہوا کہ کسی کشفی کیفیت میں یہ تماشا میرے سامنے اس وقت [illegible]تیا ہو رہا ہے، اس وقت تک تو وہ کشف تھا۔ سونے کا تمغہ اپنے سحر سے مسحور کرنے والے کے گلے میں پہنایا، اور انتظار کرتا رہا کہ میرا کشف مشاہدہ کی شکل کب اختیار کرتا ہے، دو برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ سکندرآباد کی میلاد کی مجلس میں نواب مرحوم بحیثیت خطیبِ اعظم کے شریک ہونے لگے، پھر تو غلغلہ ان کی تقریر و خطابت کا بلند ہوا کہ سارے ہندوستان کو اپنے اثر کے نیچے لے لیا، اس کے بعد تو وہ بڑے ہوئے، بڑے ہوتے چلے گئے، اتنے بڑے کہ مجھے ان کے ساتھ چھوٹے ہونے کی نسبت باقی نہ رہی لیکن ان تمام بڑائیوں میں ایک بڑائی یہ بھی تھی کہ کسی زمانے میں چھوٹے بن کر میرے سامنے چونکہ آئے تھے اس لئے باوجود بڑے ہونے اور بڑے ہوتے چلے جانے کے خلوت کی مجلس ہو یا جلوت کی، اس کا ضرور ذکر فرماتے تھے، اتنا کہتے کہ آج بھی اس کے تصور سے شرم آتی ہے، برملا دیا وہ مجھے اور میرے ساتھ جو بھی اس وقت مجلس میں موجود ہوتے سب کو سنائے چلے جاتے تھے، "بڑائی کے" اتنے بلند مینار پر پہنچنے کے بعد ان دنوں کو کون یاد رکھتا ہے جن میں وہ چھوٹوں کی زندگی گزارتا ہے! سچ یہ ہے کہ ان چھوٹے کو بڑا ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں نے بنا دیا تھا، جن کو لوگ اکثر خیال نہیں کرتے، وہی چڑھائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو اتارتے رہتے ہیں۔ من تواضع اللّٰہ رفعہ اللّٰہ (اللّٰہ کے لئے جو جھکتا ہے، اللّٰہ تعالیٰ اسے اونچا کر دیتا ہے) اس راز کی راز شناسی ہر ایک کی قسمت میں نہیں۔

(مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ ۔ کراچی

[…]ید رفعت اللہ حسینی
[…]بلہ
[…]لیر (سی دائزی)

قائدِ ملت علیہ الرحمۃ

(اُن کی سیرت کی تعمیر کس طرح ہوئی)

قائدِ ملت عام طور پر ایک جادو بیاں خطیب کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی […]
[…]ادو ان کی زبان، آواز اور لب و لہجہ سے زیادہ اُن کی عجیب و غریب سیرت میں مضمر تھا
[…] کی سیرت ہی تھی جو ان کی زندگی کے ہر پہلو کو حیرت انگیز بنا دیتی تھی۔ خلوص، بیباکی،
[…] تڑپ، جد و جہد اور کوشش اُن کی چند نمایاں خصوصیتیں تھیں۔ ان ہی کی
[…]لت ان کی زبان میں اثر، آواز میں درد اور لب و لہجہ میں شوکت پیدا ہو گئی تھی
[…]یہ نہ ہوتیں تو قائدِ ملت باوجود اپنی ساری خوبیوں کے قائد ملت نہ ہوتے اور ان کی
[…]ت و ثروت، وجاہت و شخصیت سب ہیچ ہوتیں۔ ہندوستان میں ایسی مثالیں
[…]ود ہیں جن کی دولت و ثروت، آتش بیانی اور سحر نگاری عدیم المثال ہے لیکن جن کا
[…]م پر کوئی اثر نہیں بلکہ اُلٹے لعنت و ملامت کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ قائدِ ملت نہ ایک
[…] عالم تھے اور نہ ایک زبردست مدبر و مفکر بلکہ ان کی کامیابی کا سارا راز اس میں تھا
[…]ن کے سینہ میں ایک تڑپتا ہوا دل تھا جو صداقت، خلوص اور بیباکی سے معمور تھا۔ موجودہ
[…] میں بہترین سیاست دان وہی سمجھا جاتا ہے جس کو مکر و فریب کی چالیں سب سے
[…]دہ آتی ہوں لیکن قائد ملت نے ہمیشہ ایسے مرحلوں کو جہاں قائدین ڈپلومسی کی ہزار چالیں
[…] بیباکی اور صرف بیباکی سے منٹوں کے اندر طے کیا۔ قائدِ ملت کی سیرت اقبال کے
[…]د مومن" کا ایک عملی نمونہ پیش کرتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسی سیرت کچھ وہی شخص
[…]ر سکتا ہے جس میں مجاہدے اور استقامت کی انتہائی قوت موجود ہو اور جو حق کی
[…]ت میں وقت اور ماحول کے مخالفت کی پرواہ نہ کرتا ہو۔

زمانہ کا رجحان ایک تھا۔ قائدِ ملت نے اپنی سیرت کی تعمیر ایک دوسرے رخ پر کی وہ رخ کون سا تھا اور اس میں اُنھوں نے کہاں تک اور کس طرح کامیابی حاصل کی یہ معلوم کرنا دراصل خود اپنے لیے سامانِ حیات مہیا کرنا ہے۔

نانی صاحبہ کی تربیت اور اُس کا اثر

بچپن ہی میں والدۂ ماجدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ اپنی نانی صاحبہ کے زیرِ نگرانی پرورش پانے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس نونہال پر اپنی عمر رسیدہ اور پختہ سیرت نانی کا بہت کچھ اثر ہوا ہوگا۔ وہ عقیدے اور ایمان کی پکی تھیں۔ کتب بینی سے بھی شغف رکھتی تھیں اور اپنی دلچسپی کی خاطر الہلال اور البلاغ جیسے پرچے منگوایا کرتی تھیں۔ اُنھوں نے قائدِ ملت کی پرورش کس طرح کی۔

نانی صاحبہ کا حکم تھا کہ روزانہ وہ کم از کم قرآنِ مجید کے ایک رکوع کی تلاوت کیا کریں۔ جس روز قائدِ ملت تلاوت نہیں کرتے تھے وہ گفتگو ترک کر دیتی تھیں اور کہتی تھیں "بیٹا۔ آج تم نے اپنے خدا سے باتیں نہیں کیں۔ جاؤ، میں بھی تم سے گفتگو نہیں کرونگی۔" گویا قائدِ ملت اپنی نوعمری ہی سے قرآنِ مجید کے منبعِ فیض سے سیراب ہو رہے تھے۔ اور خدا سے اپنا رشتہ جوڑ رہے تھے۔

قائدِ ملت کی تلاوت کا سلسلہ اُن کے بقائے حیات تک جاری رہا۔ اُنھوں نے محلّہ کی مسجد میں روزانہ صبح درسِ تفسیر کا سلسلہ بھی آغاز کیا تھا۔ اس کو سُننے کے لیے لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے۔ قائدِ ملت نے اس کام کو جس پابندی اور استقلال سے انجام دیا اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ بعض اوقات بارش اور سردی کی وجہ لوگ تفسیر میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک مرتبہ مسجد کے موذن اور خود ان کے سوا کوئی موجود نہ تھا لیکن قائدِ ملت وہ جو ہمیشہ ہزاروں اور لاکھوں کے مجمعوں کو مخاطب کرنے کے عادی تھے اس ایک سامع کے سامنے بھی حسبِ معمول تفسیر بیان کرنے سے باز نہیں آئے۔

الہلال اور البلاغ

نانی صاحبہ کی تربیت نے ایمان اور یقین کی جو چنگاری قائدِ ملت کے قلب میں رکھ دی تھی

اس کو ہوا دینے کے لیے الہلال اور البلاغ کے پرچوں نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ ان پرچوں کا لکھنے والا آج کیسا ہی معتوب سہی اور ان کی زبان پر اردو ادبا کیسی ہی تنقید کریں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان پرچوں نے اپنے زمانے میں تیغ و سنان کا کام کیا ہے یہ ناممکن تھا کہ کوئی سلیم الطبع انسان ان کو پڑھتا اور اس کے دل میں مذہبی دلچسپی اور ملی خدمت کی آگ نہ لگتی۔

قائدِ ملت نے خطابت کا رنگ بھی تقریباً اسی منبع سے حاصل کیا۔ ان پرچوں کی زبان ثقیل ہے لیکن ایک خطیب کی تیاری اور مہارت کے لیے الہلال والبلاغ سے زیادہ اردو کا کوئی ذخیرہ کام نہیں دیتا۔ قائدِ ملت خطابت کے شوق میں ان کے مضامین کے مضامین حفظ کر لیتے تھے۔ غرض الہلال اور البلاغ نے قائدِ ملت میں خطابت کے شوق کے ساتھ خدمت کا جذبہ بھی پیدا کر دیا۔ "فَالشَّوْقُ مَرْكَبِي" شوق ہی وہ سواری ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے اور یہی کامیابی کی کنجی ہے۔ اگر شوق نہ ہو تو انسان ناکام ہو جاتا ہے۔ قائدِ ملت کی فنِ تقریر سے دلچسپی اور عام کتب کے مطالعہ نے انہیں مدرسہ کے دوسرے مضامین میں کمزور کر دیا چنانچہ وہ میٹرک کے امتحان میں مسلسل تین مرتبہ ناکام ہوئے۔ ناکامی اکثر انسان کو پست ہمت اور ناکارہ بنا دیتی ہے لیکن صاحبِ دل اشخاص کے لیے یہی کامیابی کا زینہ اور فتح و نصرت کی نوید ہوا کرتی ہے۔ قائدِ ملت نے تاڑ دیا کہ اُن کی ناکامی کی وجہ اُن کے ذہن کی کمزوری نہیں ہے بلکہ اُن کے شوق کی راہ کوئی دوسری ہے اور خدا نے اُنہیں کسی دوسرے کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ آخر کار وہ اپنی شوق کی راہ پر گامزن ہو گئے جو اُنکی کامیابی اور کامرانی کا باعث ہوئی۔

قائدِ ملت ایک جاگیردار ہونے کی وجہ سے فکرِ معاش سے مستغنی تھے۔ مدرسہ ترک کرنے کے بعد قائدِ ملت کا اہم مشغلہ جو ان کی سیرت پر اثر انداز ہوا وہ کتب بینی تھا۔

"خطباتِ مدراس"

کتب بینی نے قائدِ ملت کو اس کتاب تک پہنچایا۔ ان کی زندگی میں یہ کتاب بہت بارہ اہمیت رکھتی ہے۔ قائدِ ملت کہا کرتے تھے کہ شاید ہی کوئی سال ایسا گزرا ہو جس میں انہوں نے

اس کتاب کا ایک نہ ایک دور نہ کیا ہو۔ یہ کتاب تقریباً اُن کے حافظہ میں محفوظ ہو گئی تھی میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں کی اکثر تقریریں اسی کتاب سے ماخوذ ہوا کرتی تھیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے ایک مرتبہ کتاب کے مصنف مولانا سلیمان ندوی صاحب کو مدعو کیا تھا۔ قائدِ ملت جو اُس وقت بالکل نو عمر تھے موجود تھے۔ جب رخصت کا وقت آیا تو قائدِ ملت نے مولانا سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ " میں آپ کا بہت پرانا شاگرد ہوں " اس پر مولانا کو تعجب ہوا کہ ایسی صورت میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ قائدِ ملت نے پھر کہا کہ " مولانا میں نے آپ کی کتاب خطبات مدراس رٹ رٹ کر میلاد کی محفلیں گرمائی ہیں۔ میں آپ کا شاگرد نہیں ہوا تو کیا ہوا" اس پر مولانا مسکرانے لگے۔

سیرت سازی

جب کبھی کوئی شخص اپنی سیرت بنانے کے لیے نکلتا ہے تو اس کو کسی نہ کسی نمونہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کو وہ پیشِ نظر رکھ کر اپنی خامیوں کو درست کرتا اور خوبیوں کو سنوارتا ہے۔ نمونہ جس قدر بہتر ہوگا سیرت بھی اتنی ہی اچھی ہوگی اگر آپ ایک سپاہی اور سپہ سالار کی زندگی کو سامنے رکھیں تو آپ میں بھی سپاہیانہ جوش و خروش اور عسکری ولولے پیدا ہو جائیں گے۔ اگر آپ کسی مفکر سے دلچسپی رکھیں تو آپ میں بھی فکر اور غور و خوض کی صلاحیت بیدار ہو جائیگی۔ اگر آپ ایک سائنس داں اور موجد کی زندگی کو پیشِ نظر رکھیں تو آپ میں بھی ایجاد و اختراع کی صلاحیتیں اجاگر ہونگی۔ اگر آپ کسی لیڈر اور سائنس داں کو نمونہ بنائیں تو آپ میں تدبیر اور فراست کا مادہ پیدا ہوگا۔ موجودہ زمانے میں عام طور پر لوگ کسی لیڈر، ڈکٹیٹر، ادیب، شاعر کی زندگی کو اپنی رہبری کا سامان بناتے ہیں لیکن قائدِ ملت نے کس نمونہ کو اپنے سامنے رکھا تھا اور اُن کی عجیب و غریب سیرت کس شمعِ ہدایت سے اکتسابِ نور کرتی تھی۔ کیا وہ نمونہ اسٹالن، ہٹلر، اتاترک کا تھا۔ نہیں۔ قرآنِ مجید کی یہ آواز قائدِ ملت کے کانوں سے ہمیشہ ٹکراتی تھی۔ "لقد کان فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" تمہارے لیے رسول کی زندگی سے بہتر کوئی نمونہ نہیں۔ قائدِ ملت اپنے بچپن ہی سے

شریف کی تعلیمات سے مستفیض ہو رہے تھے۔ اب ضرورت تھی کہ وہ اُس کی چلتی پھرتی
یعنے رسول عربی کی زندگی کو بھی پورے نقش و نگار کے ساتھ اپنے قلب و دماغ پر مرتسم
۔ اس ضرورت کو "خطبات مدراس" نے بدرجۂ اتم پورا کیا۔ اگر قائدِ ملت حضور اکرم
ندگی کے ملاوہ کسی اور کی زندگی کو نمونہ بناتے تو اُن میں وہ خصوصیات پیدا
ں ہوتیں جو اُن کی کامیابی کی کلید ہیں۔

سیرتِ نبوی سے والہانہ عشق

قائدِ ملت کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت تھی۔ جب کبھی
ع الاوّل کا مہینہ آتا تو وہ بیچین اور مضطرب ہو جاتے۔ گلی گلی کوچہ کوچہ تقریریں
تے اور پکار پکار کر سامعین کو سیرت نبوی کی طرف متوجہ کرتے۔ اس زمانہ میں
ِ ملت کی تقریروں کا اوسط ہر مہینہ تقریباً تیس بتیس ہوتا۔ محبت اور وہ بھی خدا
حبیب سے محبت انسان کو معراجِ کمال پر پہنچا دیتی ہے۔ اس محبت نے قائدِ ملت
ں سیرت و کردار کی ہزار خوبیاں پیدا کر دی تھیں۔ انتہائی خلوص، درد، تڑپ، بیباکی
و جہد، کوشش سب اسی محبت کے مرہونِ منت ہیں۔ یہی محبت ان کی تقریروں
روح اور جان تھی اور اسی سے ان کی زبان میں سحر اور جادو کا اثر تھا۔ ایک مرتبہ
ؤریہ پلے گراؤنڈ پر میلاد النبی کا جلسہ منعقد تھا اُس میں قائدِ ملت شائد سیرتِ نبوی
جامعیت پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کچھ عجیب و غریب انداز کی تھی۔ اتفاق سے
حضرت جلالت الملک بھی وہاں موجود تھے۔ تقریر کا اُن پر بیحد اثر ہوا اور دوسرے
دن وہ " نواب بہادر یار جنگ بہادر" کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔

دولت و امارت

قائدِ ملت اس تنومند، تن پرور اور تن آسان طبقہ میں پیدا ہوئے تھے جس کو جاگیردا
جاتا ہے۔ دولت خدا کی ایک نعمت ہے اگر اس کا صحیح استعمال نہ کیا جائے تو اس سے
ھ کر کوئی لعنت نہیں۔ وہ شخص قابلِ رشک ہے جو دولت پاتا ہے اور اُس کو نیک
تہ میں خرچ کرتا ہے۔ اکثر امراء کی عشرت اندوزیاں ہی قوم اور ملت کی تباہی کا

باعث ہوئے ہیں۔ دولت کی نعمت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ خدا انسان کو ایک امتحان میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس میں بہت کم لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ دولت ہمیشہ غرور و تمرد کا باعث ہوتی ہے اور انسان کو صراطِ مستقیم سے ہٹا کر عیش و عشرت کی طرف راغب کرتی ہے۔ قائدِ ملت ایسے ماحول میں پلے یہاں عیش و آرام کی بے حساب ترغیبات موجود تھیں اور جس میں قائدِ ملت جیسی سیرت کا انسان پیدا ہونا ایک عجوبہ سے کم نہیں اُنہوں نے ان تمام ترغیبات کے خلاف مکمل جہاد کیا اور دولت و امارت کی وجہ سے اپنے اندر غرور و تمرد۔ تن آسانی و عشرت پسندی کو پیدا ہونے نہیں دیا یہی قائدِ ملت کا سب سے بڑا کمال ہے ورنہ اُن کی عظیم الشان سیرت کی بنیاد ہی نہیں پڑتی۔ یہاں اقبال کی یہ دعا پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہے

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

خاموش کام

آج کل قومی خدمت کرنے والے ہمیشہ اپنی نیک نامی اور شہرت کے خواہاں رہتے ہیں اور ایسے ہی کاموں میں زیادہ حصہ لیتے ہیں جس میں انکو ناموری کا موقع ملے۔ قائدِ ملت نے پہلے ہی سے اپنے قلب کو ایسی ساری باطل خواہشات سے پاک کر لیا تھا۔ اُنہوں نے ایک خاموش کام شروع کیا جس کو تبلیغ کہتے ہیں اور یہ ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا اور لیڈرانہ کارنامہ ہے اس کے ذریعہ انہوں نے تقریباً بیس ہزار نفوسِ انسانی کو مشرف بہ اسلام کیا اس کے لیے وہ چھوٹے قصبوں کے دورے کرتے سخت سے سخت مصیبتیں برداشت کرتے۔ غربار کی امداد کرتے اور بچوں کی تعلیم کے لیے اپنے صرفہ سے مدرسے کھولتے تھے۔

تبلیغ کا کام کوئی آرام دہ [illegible] کا کام نہیں۔ یہاں سب سے زیادہ خلوص محبت استقلال اور انکساری کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ قائدِ ملت نے اس کام کو جس عرق ریزی اور جانفشانی سے انجام دیا وہ قابلِ رشک ہے۔ انکے تجربات بیحد دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ قائدِ ملت کے اس کارنامے سے بہت کم لوگ واقف ہیں اور یہی امر یہ ثابت کرتا ہے کہ اُنہوں نے شرف و ناموری کے لیے قومی خدمت میں حصہ نہیں لیا تھا۔ انکا مقصدِ اصلی صرف خدمتِ دین اور خدا کی خوشنودی تھا۔

خاکسار تحریک

...لت نسلاً پٹھان تھے۔ عسکری جذبہ ان میں وراثۃً ودیعت تھا۔ انہیں جسمانی ورزش
...انہ اندازی سے ہمیشہ دلچسپی تھی۔ پیراکی بھی بہترین جانتے تھے۔ سپاہیانہ تربیت
...ہوں نے خاکسار تحریک میں حصہ لیا۔ وہ ایک قائد ہی نہیں بلکہ ایک بے مثال رضاکار
...خاکسار تحریک کے سلسلہ میں انہوں نے اطاعتِ امیر کی بہترین مثالیں دیں۔
...مرتبہ وہ وقتِ مقررہ سے صرف دو منٹ دیر سے پہنچے۔ اس پر سالار نے سزا کے
...حکم دیا کہ وہ میدان کے دوڑتے ہوئے دو چکر لگائیں۔ ہزارہا کا مجمع موجود تھا جس کے
...تھے لیکن انہوں نے اس مجمع کے سامنے اپنے پورے تن و توش کے ساتھ ذرّے
...ہ برابر بھی دریغ نہیں کیا۔
...ب کبھی غلطی ہوتی تو وہ فوراً تسلیم کر لیتے اور متعدد مرتبہ انہوں نے اپنی غلطیوں
...ی سزا پائی۔
...ئدِ ملت کی زندگی میں سپاہیانہ پہلو بہت نمایاں نظر آتا تھا۔

اقبال کا کلام

...ئدِ ملت کو اقبال سے دلچسپی نہیں بلکہ عقیدت تھی۔ اُن کی سیرت کی تعمیر میں اقبال
...م کا بہت کچھ اثر ہے۔ وہ اقبال کے کلام کو قرآنِ مجید، احادیثِ پاک کی تفسیر سمجھتے
...ن کا خیال تھا کہ جس طرح والٹیر اور روسو کی تحریریں انقلابِ فرانس کا باعث
...و اُسی طرح اقبال کا کلام بھی ایک اسلامی انقلاب کا باعث ہوگا۔ انہوں نے
...کان پر درسِ اقبال کا آغاز کیا تھا جس میں وہ خود موجود رہتے اور دلچسپی لیتے
...ن کی خواہش تھی کہ جلد از جلد عوام اور خصوصاً نوجوان اقبال فہم بن جائیں
...ی زبان پر اکثر اقبال کے اشعار کا وِرد رہتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُن کی سیرت
...ر میں اقبال کے خیالات اور تفکرات کا بھی بہت اثر تھا۔

ندوۂ ادب مارچ ۱۹۷۷ء

ثناءالحق صدیقی

ایک مردِ مومن

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ ان نفوسِ قدسیہ میں سے تھے جن کو قدرت طرح طرح سے نوازتی ہے۔ وہ اللہ کی نشانیوں سے ایک نشانی تھے۔ جنھوں نے حیاتِ مستعار کی محض انتالیس بہاریں دیکھیں لیکن لوگوں کے قلوب پر اپنی مختلف اور گوناگوں کا ایسا اثر چھوڑا کہ جب ۲۵ر جون ۱۹۴۴ء کو وہ دنیا سے اچانک رخصت ہوئے تو زبانِ حال سے یہ مصرعہ دہرا رہے تھے۔ ع
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما۔ وہ شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے لیکن دنیا کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے چکاچوند پیدا کر گئے۔

بہادر یار جنگ مرحوم ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو کئی پشتوں سے عزت و جاہ اور دولت و ثروت سے سرفراز تھا اور "شمشیر و سناں" کے مرحلہ کو طے کرکے "طاؤس و رباب" کی منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ اُن کے والد نصیب یاور جنگ دنیا کی رنگینیوں میں محو تھے۔ نوابی ٹھاٹ جمے ہوئے تھے عیش کوشی اور اسراف بیجا کی برائیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور فضولیات پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ چنانچہ شبِ برات کے موقع پر سیکڑوں روپے آتشبازی میں خرچ کردیے جاتے۔ آگ کے الاؤ روشن کئے جاتے اور اُس کے گرد رقص کی محفل جمتی۔ ان فضول خرچیوں کی بدولت لاکھوں روپے کا قرض کا بوجھ اپنے سر پر لاد لیا اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے کم عمر بیٹے کے لئے زمین جائیداد کے علاوہ قرضہ کا یہ بارِ گراں بھی بطور ترکہ چھوڑ گئے۔

ایک ایسے گھرانے میں قدرت نے بہادر یار جنگ کو فطرتِ سلیم دے کر بھیجا اور اُن کی تربیت کے لئے ایک ایسی ہستی کو منتخب کیا جو پوری طرح مذہب کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ وہ مقدس ہستی بہادر یار جنگ کی نانی تھیں۔ چودہ برس یہ نونہال اُن کے زیرِ تربیت رہا۔ اور جب نوجوانی کی منزل میں داخل ہوا تو پوری طرح صبغۃ اللہ میں ڈوبا ہوا۔ یہ رنگ اتنا گہرا تھا کہ مدت العمر اُس میں کمی نہیں ہوئی بلکہ وہ سن و سال کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور نکھرتا ہی گیا۔ گو اُس نے اپنی ہستی کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق بنا کر پیش کیا۔

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ

(اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اُس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا۔)

اپنی نانی کے اس احسان کو بہادر یار جنگ عمر بھر نہ بھولے۔ اور ہمیشہ اس بات کا اعتراف کرتے رہے۔

"جو کچھ مجھ میں ہے وہ اسی چودہ سالہ کمائی کا حاصل ہے۔"

اُن کے وجود میں جو ہمیں قوسِ قزح کے رنگ دکھائی دیتے ہیں وہ تمام تر دین کی اُس ایک شعاع سے پیدا ہوئے

،ان کی پوری ہستی کو گھیر رکھا تھا۔ دین ہی نے اُن کو ”دلِ گرمے۔ نگاہِ پاکے بینے جانِ بیتابے“ کا دلکش پیکر بنا دیا تھا۔ اسی سے
خلق و انکسار کی اعلیٰ صفات پیدا ہوئیں۔ اسی سے محبت و عشق کی تخلیق ہوئی۔ اسی سے اخلاص، مروت اور تواضع نے اُن کے دل
ر کیا اور اسی سے جوشِ جہاد، عشقِ رسولؐ اور قوم و ملت کے لیے ہمدردی کے جذبات اُن کے جوفِ قلب میں بیدار ہوئے۔
ے مسلمانوں میں اُن کی دلربا شخصیت اگر کسی ایک فرد کے مقابلہ میں لائی جا سکتی ہے تو وہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر
ت ہے جو ان تمام خوبیوں سے متصف تھی جو ہمیں نواب بہادر یار جنگ میں نظر آتی ہیں۔

بہادر یار جنگ نہایت کم عمر میں یتیم و یسیر ہو گئے تھے۔ ہفتہ بھر کے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اٹھارہ سال کے تھے
لد بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ تھوڑی سی ہی عمر میں تمام ذمہ داریاں اُن کے کمزور شانوں پر آ پڑیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کا سلسلہ جو ابھی
ے کی منزل میں تھا منقطع ہو گیا لیکن قدرت کی جانب سے علم کا جو شوق اُن میں ودیعت ہوا تھا اس نے ان کو اس تعلیم پر قانع نہیں
دیا۔ اور انھوں نے نجی طور پر عربی اور دینی علوم کی تحصیل کا سلسلہ جاری رکھا۔ مولوی سعد اللہ خاں مندوزئی اور سید اشرف علی
ی سے عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ اور صرف و نحو کا درس لیا۔ لیکن ان ذریعوں سے بھی صرف بنیادی تعلیم ہی حاصل ہو سکی ان میں جو کمال
ب ہوا وہ نتیجہ تھا خود اُن کی ذہانت، ذاتی کوشش اور وسعتِ مطالعہ کا۔ وہ خود اس حقیقت کا اظہار اپنے ایک مکتوب میں اس طرح کرتے تھے۔
”پہلے اجازت دیجیے کہ خود میں بے لاگ جائزہ لوں جس میں نہ انکسار ہو، نہ تعلی شاعرانہ میری قابلیت علمی جا ہے علوم دا
تیہ سے متعلق ہو جا ہے علوم حدیثہ مغربیہ کی نسبت، بہت سطحی اور صرف بقدرِ ضرورت ہے۔

ب دوسری

”میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں تک کسی سے سبقاً سبقاً نہیں پڑھیں۔ صرف عربی ہی کی تعلیم ہوئی ہے۔“
کسی عام آدمی کے لیے اس قدر تحصیلِ علم اُس کو صرف خواندہ لوگوں کی صف میں جگہ دے سکتی ہے علمیت کے بلند مرتبہ
فائز کرنے کے لیے کسی طرح بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایک با صلاحیت انسان اُس سے کس قدر استفادہ کر سکتا ہے اس کا
ح اندازہ ہمیں قائدِ ملت بہادر یار جنگ کی مثال سے ہو سکتا ہے۔ ان کی فطری صلاحیتوں میں بڑی حیثیت اُن کے غیر معمولی حافظہ
ل ہے قدرت نے انھیں ایسا قوی حافظہ عنایت فرمایا تھا کہ وہ جب کسی کتاب کو ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے تو وہ انھیں مدت العمر
رہتی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ اوائلِ عمر میں کیا تھا پھر دیگر مصروفیات نے کبھی اس کو دیکھنے کا
قع نہیں دیا۔ لیکن آخر عمر تک وہ جس اعتماد اور صحت کے ساتھ واقعاتِ تاریخی بیان کرتے اور اُن کتابوں کے حوالے دیتے جن سے
واقعات ماخوذ ہوتے تھے اُس کو دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اُردو اور فارسی کے اکثر شعرا کے بے شمار اشعار اُن کی نوکِ
ن پر تھے۔ اور دورانِ تقریر وہ بہ آسانی اور نہایت برجستہ و برمحل مولانا جلال الدین رومی۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی۔ مرزا غالبؔ۔ داغؔ
ی اور محمد ابراہیم ذوقؔ کے اشعار پڑھتے چلے جاتے تھے۔ حافظہ کی اس خوبی کا اظہار اور موقعوں پر بھی اس طرح ہوتا تھا کہ دیکھنے والے
کو اُن کا اعجاز سمجھنے لگتے تھے۔

قائدِ ملت کی خوبی یہ تھی کہ جو کچھ اُن کے مطالعہ میں آتا وہ اس کے اصل منشا ... ح کو پا جاتے تھے۔ قوتِ حافظہ
اُن کی اس خوبی میں مزید جلا پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ برسوں پہلے کی پڑھی ہوئی کتابوں کے مضمون کو دہرا دینے کے علاوہ اُس کے اہم نکات

ری خیالات کو اس طرح بیان کر دیتے تھے گویا انھوں نے حال ہی میں اُن کا مطالعہ کیا ہے۔
سیاست اور معاشیات کے دقیق موضوعات کو بھی بڑی آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔ اور نہایت خوبی سے اُن کو بیان کر دیتے
ن مسائل کی توضیح و تشریح پر بعض اوقات ماہرینِ فن بھی انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ بڑی
و طویل بحثوں کو چند الفاظ میں اس طرح بیان کر دیتے تھے کہ اُن کا پورا مقصد و منشا واضح ہو جاتا تھا۔
یہ تو وہ قدرتی عطیات تھے جو قائد ملت کو نہایت وافر مقدار میں عطا ہوئے تھے۔ خود اُن کی کاوش و کوشش نے ان کی ان
یتوں کو بہت چمکا دیا تھا۔ ناسازگار حالات نے اُن کی طالب علمانہ زندگی کو بہت جلد ختم کر دیا تھا لیکن وہ اُن کے ذوق مطالعہ کو
لعم ختم نہ کر سکے۔ اُن کا ذخیرۂ کتب ان محدودے چند کتب خانوں میں سے تھا جو نادر و نایاب کتابوں سے مزین ہوتے ہیں۔
مختلف علوم و فنون کی بہترین اور معیاری کتابیں جمع تھیں۔ لیکن یہ کتابیں الماریوں کی زینت بنانے کے لئے اکٹھی نہیں کی گئی تھیں
یں سے اکثر کتابوں کا انھوں نے مطالعہ کیا تھا اور ان پر جگہ جگہ اپنے مطالعہ کے نشانات بنائے تھے۔ بہت سی کتابیں ایسی تھیں جن کو
رتبہ سے زیادہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ تاہم وہ بھی ان کو اُسی طرح مستحضر تھیں جس طرح دوسری کتابیں۔ کثرت مطالعہ نے
ی صلاحیت بخشی تھی کہ جب اُنھوں نے مختلف ممالک کا سفر کیا تو اُن کی ملاقات ہر علم و فن کے ماہرین سے ہوئی۔ اور انھوں نے
ضوع پر اس خوبی سے اُن ماہرین سے گفتگو کی کہ وہ حیران رہ گئے۔
اس ضمن میں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ مذہبی مطالعہ کے سوا اُنھوں نے کسی علم و فن کو اپنے شوق سے نہیں سیکھا
ورت کی بنا پر اُن کا مطالعہ کیا۔ لیکن اپنی فطری صلاحیتوں کی وجہ سے وہ اُن فنون میں بھی پست نہیں رہے۔
اُن کو زبان دانی کا بھی وہ ملکہ قدرت کی جانب سے عطا ہوا تھا کہ بہت قلیل مدت میں اجنبی زبانوں کو سیکھ جاتے
اور اُن کو اس خوبی سے کام میں لاتے تھے کہ اہلِ زبان بھی اُن کی مہارت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ بقول ڈاکٹر رضی الدین
ی " دنیائے اُردو کے تو وہ سب سے بڑے خطیب تھے اس لئے ان کی اُردو دانی کا تذکرہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ عربی
فارسی میں بھی اُن کی مہارت مسلمہ تھی "
اُن کی گھریلو زبان ٹھیٹھ دکنی تھی۔ لیکن انھوں نے عبدالحلیم شرر۔ محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا گہری نظر
طالعہ کر کے اُردو زبان میں وہ مہارت اور فصاحت حاصل کر لی تھی کہ اُردو کے مراکز کے بہت کم باشندوں کو وہ بات
ب ہوتی ہے۔ وہ اس زبان میں تقریر اور تحریر ہی کی حد تک قدرت نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کے ایک اچھے ناقد بھی تھے۔
ے اور مراسلت کی زبان عموماً اُردو ہوتی تھی اور ان دونوں کے بے شمار نمونے ہمارے سامنے ہیں اُن کو دیکھ کر اندازہ
ا سکتا ہے کہ اُن کی اُردو تحریر و تقریر کا کیا معیار تھا۔
صرف عربی زبان ایسی تھی جس کی تعلیم انھوں نے باقاعدہ اساتذہ سے حاصل کی تھی۔ اس میں اُن کو اس قدر مہارت
تھی کہ نہ صرف عربی کتابوں کو پڑھ اور سمجھ لیتے تھے بلکہ اہلِ زبان کے ساتھ بے تکلفی سے گفتگو کر سکتے تھے۔ اور عربی میں بڑی
ی اور فصاحت کے ساتھ تقریر بھی کر لیتے تھے۔
فارسی میں انھوں نے گلستاں جیسی کتابوں کا بھی درس کسی سے نہیں لیا۔ لیکن اس زبان پر بھی اُن کو اتنی قدرت حاصل ہو گئی

خود اہلِ زبان کے ساتھ نہایت بامحاورہ فارسی میں گفتگو کر لیتے تھے جب وہ افغانستان گئے اور وہاں غازی نادر شاہ شہید
، تو اُن سے ایسی فصیح اور محاورہ فارسی میں گفتگو کی کہ وہ بھی سُنکر حیران و ششدر رہ گئے اور اپنے مصاحبین
ہمانے لگے۔

"نواب صاحب در زبانِ فارسی خیلے خوب گپ می زنند"

انگریزی زبان کا مطالعہ صرف میٹرک تک کیا تھا لیکن اپنی محنت اور توجہ سے تھوڑی ہی مدت میں اُس میں بھی اس
ہارت حاصل کر لی تھی کہ بے محابا اس زبان میں اظہارِ خیال فرمانے لگے تھے۔ انگریزی تحریروں اور تقریروں کا بامحاورہ اُردو
جمہ کرنے پر قادر تھے۔

پشتو کا علاقہ دکن سے کافی بعید فاصلے پر ہے اس لئے اس زبان سے ایک دکنی کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا لیکن
ت کو جب ضرورت پڑی تو انھوں نے دو ماہ میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ پبلک جلسوں میں وہاں کئی تقریریں اسی زبان میں
اور وہاں کے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ یا تو مسلم لیگ کا نام سننے کے روادار نہیں تھے یا بڑی تیزی سے لیگ کے جھنڈے
جمع ہونے شروع ہو گئے اور کچھ ہی عرصہ میں وہاں کی سیاسی فضا لیگ کے حق میں سازگار ہو گئی۔

بولنے کی حد تک اُن کو مرہٹی، تلنگی اور دیہاتی اُردو پر بھی کافی دسترس حاصل تھی۔ اور اگرچہ اُنھوں نے ان کو لکھنے
ی مشق نہیں کی لیکن اس قدر روانی اور بے تکلفی سے یہ زبانیں بولتے کہ لوگ سُنکر بیحد متاثر ہوتے۔

اس کثرت زبان دانی کی بدولت قائدِ ملّت کو مختلف علاقوں میں تبلیغ کرنے کا موقع ملا اور نہایت قلیل مدت میں وہ
مسلمہ کے ایک بڑے طبقہ پر اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ہزاروں غیر مسلم اُن کی تبلیغ سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

قائدِ ملّت کو قرآنِ حکیم سے بیحد اُنس اور لگاؤ تھا۔ یہ لگاؤ اُن کی نانی نے اُن میں پیدا کیا تھا۔ وہ بچپن میں اُن پر سب سے
ی زور قرآن پڑھنے پر دیتی تھیں۔ جس دن اُنھیں معلوم ہوتا کہ "آج بہادر خاں نے قرآن نہیں پڑھا ہے" اُس دن وہ اُن سے یہ کہہ کر
لو کرنا ترک کر دیتی تھیں۔"

"تم نے آج اللہ سے باتیں نہیں کیں، میں تم سے بات نہ کروں گی۔"

ی اس تنبیہ نے جہاں اُن کو تلاوتِ قرآن کا زیادہ سے زیادہ عادی بنایا وہاں اُن کے ذہن میں یہ بات بھی بٹھا دی کہ "قرآن
ل اللہ کا کلام ہے اور اُس کے مطالعہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس کتاب کو سمجھ کر پڑھے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اللہ کے
م پر عمل کر کے انسان کیا فوائد حاصل کر سکتا ہے۔" اس خیال نے اُنھیں قرآن فہمی کی جانب مائل کیا اور انھوں نے اپنی
کا خاص مرکز اسی کو بنا لیا۔ اس کے لئے علماء سے فیضاب ہوئے اور مختلف تفسیروں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ پہلے
ت معانی و مطالب پر نگاہ رہی پھر قرآن سُنکر دل پر ایک کیفیت طاری ہونے لگی۔ اور علامہ اقبال کی اس ہدایت
ں ہونے لگا ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب   گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

تفسیر کی کتابیں کشادِ دل کے لئے اتنی موثر نہیں رہیں جتنے خود قرآن کے الفاظ۔ آخر میں یہ کیفیت ہو گئی کہ تفسیر کا درس

بیتے وقت جیسے ہی قرآن کے الفاظ پر اُن کی نظر پڑتی تھی ایک سیل اشک آنکھوں سے جاری ہو جاتا تھا۔

قرآن سے اسی لگاؤ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے قرأت بھی باقاعدہ سیکھی اور بطور فن، تجوید میں وہ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے قاری اُن کی رائے کو سند کا درجہ دینے لگے۔

تفسیر کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مرحوم نے ضروری سمجھا کہ اس سے دوسروں کو بھی فیضیاب کیا جائے چنانچہ انھوں نے یہ معمول بنا لیا کہ جب حیدر آباد میں ہوتے تو بلاناغہ نمازِ فجر کے بعد ایک گھنٹہ لوگوں کو تفسیر کا درس دیتے تھے اور اس کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جاڑا، گرمی اور برسات میں سے کوئی چیز بھی اُن کے اس معمول میں رکاوٹ نہ بنتی۔ نوابی ٹھاٹ کو چھوڑ کر ایک چھوٹی سی مسجد میں چٹائی پر بیٹھ جاتے اور کلام اللہ کی تفسیر بیان کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے کہا بھی کہ "کسی نواب کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح چٹائی پر بیٹھ کر تفسیر بیان کرے" لیکن انھوں نے کبھی کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں کی اور اپنے کام کو نہایت باقاعدگی اور خلوص سے جاری رکھا۔ البتہ بطور انکسار کبھی کبھی یہ ضرور کہہ دیتے کہ میں نے جو یہ ذمہ داری لی ہے اس کا میں کسی طرح بھی اہل نہیں ہوں۔ مفسر کا مقام نہایت بلند ہے اور مجھ میں یہ اہلیت نہیں کہ اس بلند مقام پر بیٹھوں۔ کسرِ نفسی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> "میں تفسیر بیان نہیں کرتا بلکہ تفسیر سناتا ہوں۔ میں تفاسیر دیکھنے کا عادی ہوں اور یاد رکھنے کے لئے روزانہ صبح، میں پڑھی ہوئی چیزوں پر غور کر لیا کرتا ہوں خیال ہوا کہ اگر یہی کام مسجد میں کروں اور خاموشی سے سوچنے کے بجائے بلند آواز سے کہتا جاؤں تو دوسروں کو بھی فائدہ ہوگا۔ اسی لئے میں نے اس جگہ بیٹھ کر کہنا شروع کر دیا۔"

حاضرین میں پندرہ بیس آدمیوں سے زیادہ نہ ہوتے تھے، مگر انھوں نے کبھی اس بات کی پروا نہ کی اور کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ جہاں تقریر کے وقت ہزاروں اور لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے وہاں چند آدمیوں میں بیٹھ کر تفسیر بیان کرنا میری شان کے خلاف ہے۔ کہتے کبھی کبھی انھیں اس بات کا افسوس ضرور ہوتا کہ "میری عام تقریروں کو اس قدر دلچسپی سے سننے والوں میں سے صرف چند حضرات ایسے ہیں جو کلام اللہ کی تفسیر سننے کے لئے آتے ہیں۔ حالانکہ تفسیر سے متعلق گفتگو میری ہر تقریر سے اچھی اور مفید ہوتی ہے۔"

اُن کا کہنا تھا کہ تفسیر بیان کرنے سے میرا مقصد مسلمانوں کو قرآن سے آشنا کرنا ہے۔ اس چیز کی یقیناً اُس وقت بھی ضرورت تھی اور آج بھی ضرورت ہے اس لئے کہ مسلمانوں پر سارا ادبار اسی لئے ہے کہ انھوں نے قرآن سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہے۔ جب تک یہ تعلق دوبارہ قائم نہیں ہوگا یہ ادبار دور نہیں ہوگا۔

تفسیر بیان کرنے سے پہلے نواب صاحب اس کے لئے پوری تیاری کرتے تھے۔ جن آیات کی تفسیر بیان کرنا ہوتی تھی اُن سے متعلق قدیم و جدید تفاسیر کا مطالعہ رات کو سونے سے قبل یا صبح نمازِ فجر سے پہلے کرتے نمازِ فجر کے لئے نہایت سادہ لباس پہن کر مسجد میں آتے۔ نماز خود پڑھاتے اس کے بعد چند آیتیں تلاوت کر کے اُن کی تفسیر بیان کرتے اور اسی سلسلہ میں فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتے، فقہ کے مسائل بیان فرماتے، معرفت کی باتیں بتاتے اور موقع موقع سے صرفی اور نحوی

بیان جاتے تھے۔ جب کوئی سورت ختم ہو جاتی تو اس کا خلاصہ بتا دیتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ کو تعلیمات اقبال سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کلام اقبال بھی بیشتر قرآن ہی کی ۔ درسِ اقبال ہر ہفتہ ہوتا تھا۔ اور کئی نامی گرامی حضرات مل کر اُس کی تشریح و توضیح کرتے۔ یہ حضرات ڈاکٹر ین صدیقی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور مولوی غلام دستگیر تھے۔ یہ لوگ کلام کے فلسفیانہ پہلو پر روشنی ڈالتے ب صاحب قرآنی توجیہہ بیان فرماتے۔

نواب صاحب کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت اُن کی خطابت کی وجہ سے ہوئی۔ خطابت کے لئے ں کی ضرورت ہے وہ سب قدرت نے اُن کی ذات میں جمع کر دی تھیں۔ اُن میں سطوت ذاتی تھی، بلند ، اور موثر لہجہ تھا۔ ان تین خوبیوں کے ساتھ وہ ادعا، تحکم اور تکرار سے کام لے کر تاثیر کا طلسم پیدا تھے۔ پھر فصاحت و بلاغت کے زیور سے تقریر کو مزین کر کے سامعین کو بالکل ہی مسحور کر دیتے تھے۔ کی کثرت۔ پیش کرنے کا انداز خطیب کی تڑپتی ہوئی روح، مچلتا ہوا دل، عشق کی گرمی اور ایمان کی حرارت زمات تھے جو خطابت میں ساحری کا رنگ بھر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ خود بھی اپنی خطابت پر ناز کرتے ہوئے ی طور پر یہ رُباعی کہہ گزرے تھے۔

آگاہِ رموزِ دینِ فطرت ہوں میں — کچھ مجھ سے سنو، لسانِ اُمت ہوں میں
بی خطبہ سرا نہیں تو سونی ہے بزم — شاہنشہِ اقلیم خطابت ہوں میں

اگرچہ یہ کوئی بیجا ادعا نہیں تھا بلکہ حقیقت کا اظہار تھا تاہم بعد میں جب اُنھوں نے الفاظ پر غور کیا تو محسوس یہ شانِ عبدیت کے خلاف ہے لہٰذا ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔

دولت کو جہاں کی آنی جانی سمجھو — عزت کو خدا کی اک نشانی سمجھو
اتراؤ نہ اپنی خوش بیانی پر خلق — اس کو بھی خدا کی خوش بیانی سمجھو

ش بیانی پر لوگ اس قدر فریفتہ تھے کہ جہاں اُن کی تقریر ہونے والی ہوتی وہاں سامعین ہزاروں بلکہ بعض لاکھوں تک جمع ہو جاتے تھے۔ اور بڑے بڑے مقرروں اور خطیبوں کو اُن کے مقابلہ میں خاطر میں نہ لاتے ب مرتبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نواب صاحب اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی تقریریں ایک ساتھ رکھ ، اور پہلے مولانا دریابادی کو کھڑا کر دیا گیا۔ اُس وقت جو منظر سامنے آیا اُس کی روداد خود مولانا ہی ی سُنیئے۔ فرماتے ہیں۔

"۲۶ اکتوبر ۱۹۴۱ء بمقام علی گڑھ یونیورسٹی کی مجلسِ تاریخ تمدن اسلامی کی دعوت پر میرا اور نواب صاحب کا دونوں کا بیان ہونے والا تھا۔ نواب سحر بیان کی خطابت بچے بچے سے تحسین حاصل کئے ہوئے اہلِ جلسہ نے غلطی کر کے مجھ جیسے کج مج زبان کا وقت اس بلبل ہزار داستان کے ساتھ رکھ دیا وسیع اور لق و دق اسٹریچی ہال اوپر سے نیچے تک بھرا ہوا۔ سامنے جو لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اس نے جواب دے دیا۔

اب بھلا میری آواز کیا پہنچتی، ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے۔ کچھ سنائی نہ دیتا ہم تو نواب صاحب کے مشتاق ہو کر آئے ہیں۔ میں تو پہلے ہی سے ہٹنے پر آمادہ تھا۔ لہٰذا صدر صاحب سے معذرت کر کے ڈائس سے اترنے لگا، معاً نواب صاحب کھڑے ہوئے اور گرج کر بولے "کوئی سنے یا نہ سنے کوئی بیٹھے یا چلا جائے میں خود مولانا کے بیان کو اخیر تک سنوں گا۔ میں تو انہی کا لکچر سننے آیا ہوں، اور جب تک وہ اپنا لکچر ختم نہ کریں گے۔ میں ہرگز ایک لفظ بولنا نہ شروع کروں گا۔" مجمع میں سناٹا چھا گیا! ——— ہے کہیں اس دور میں شرافت کی ایسی مثال؟"

ملّت کے لئے مر مٹنے کی جو تمنا رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے دل میں تھی، کم و بیش وہی قائد ملت میں دکھائی دیتی۔ بعض حضرات نے چاہا کہ وہ خود کو ایک مخصوص علاقہ کے مسلمانوں کی اصلاح تک محدود رکھیں لیکن وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے اور غیر مبہم الفاظ میں اپنے مقصد کا اظہار ان الفاظ میں فرما دیا۔

"میرا مقصدِ حیات ایک اور متعین ہے اور وہ ملّتِ اسلامیہ کی خدمت ہے، آپ عام طور پر تمنا کر سکتے ہیں کہ میں ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ "دکن" کا لفظ بڑھا دوں اور مجھے اس میں کبھی عذر نہیں ہے، کیونکہ میں خود دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں عالم ارضی پر بسنے والی ساری ملّتِ اسلامیہ کی خدمت کر سکتا ہوں، مجھے اپنی محدود طاقت اور صلاحیت کا اندازہ ہے خود انبیا علیہم السّلام کے حدودِ عمل، جن کے ساتھ وحی و الہام کی طاقتیں ہوا کرتی تھیں ہمیشہ محدود رہے اور ساری صفِ انبیا میں صرف ایک قدسی مرتبت ذات ہم کو ایسی ملتی ہے جس کے حدودِ عمل کافۃ الناس کے لئے بسیط ہیں۔ ان کے غلاموں کی خاکِ پا کو اپنے لئے سُرمۂ چشمِ بصیرت سمجھتا ہوں، غیر محدود خدمت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، بے شک میرا مخدوم ملّتِ اسلامیہ "دکن" ہے۔

"لیکن آپ کو جاننا چاہیئے حیدرآباد، ہندوستان کے سمندر میں ایک جزیرہ ہے اس سمندر میں جتنی سیاسی لہریں اٹھتی ہیں وہ لازماً اس جزیرہ سے ٹکراتی ہیں اور کوئی شخص ملّتِ اسلامیہ دکن کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا جب تک وہ ہندوستانی سمندر سے اٹھنے والی سیاسی لہروں پر قابو نہ رکھتا ہو یا کم از کم ان سے قریب ترین یا راست واقفیت نہ رکھتا ہو۔ میری تمام بیرونِ حیدرآباد مساعی کی علتِ غائی انھیں لہروں سے قریب تر رہنے کی تمنا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ حیدرآباد سے باہر قدم رکھنے کے بعد میری آوارہ منشی طبع میرے لئے بلا ہو گئی اور میرے نغموں نے ہر چمن میں میرے لئے ایک دام بچھا دیا اور ہر صوبۂ ہند نے چاہا کہ میں اس کے قفس کا اسیر ہو جاؤں لیکن آپ اطمینان رکھیں دام چاہے کتنے ہی ہم رنگ زمین ہوں، اُن کو پہچانتا ہوں اور اگر کبھی ان میں پھنسا بھی ہوں تو عمداً اور اپنے پروں کی طاقت کا اندازہ کر کے اس یقین کے ساتھ پھنسا ہوں کہ دام کو لے کر اُڑوں گا اور صیاد سمیت حیدرآباد سے قریب تر کر دوں گا۔"

قائد ملت، قوم و ملّت کے لئے قوتِ عمل اور عسکریت کو لازمی سمجھتے تھے۔ اسی اسلامی عسکری ذہنیت نے اُن کے دل میں حضرت عمرؓ کے لئے غیر معمولی محبت و عقیدت پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے اکثر فرمایا۔

"کوئی کسی کا قائل ہے کوئی کسی کا قائل ہے، میں تو نفرۂ عمرؓ کا گھائل ہوں۔"

ت کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے سب سے زیادہ غفلت عسکریت ہی کے معاملہ میں کی ہے اور ملت مسلمہ کے زوال
ب میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل ہے۔ لہٰذا اسی صفت کو پیدا کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔
ن اتحاد مسلمین کے اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے نہایت درد مندی سے فرمایا تھا :
نے آپ سے مخاطبت کے کسی موقع کو اس درخواست کے بغیر ختم ہونے نہیں دیا اور آج بھی آپ کی خاص توجہ
رف مبذول کرواتا ہوں کہ مسلمان کی زندگی کا نمایاں پہلو عسکریت و سپاہیت ہے۔ جس حیات مقدس
نات ارضی کے سارے انسانوں کے لیے نمونہ بنایا گیا اس پر اگر آپ کی نظر رہے تو آپ دیکھیں گے کہ
د و ہدایت کے عظیم الشان فرائض کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ جو پہلو اس حیات طیبہ میں سب سے
نمایاں نظر آتا ہے، وہ آقائے دوجہاں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عسکریت ہے۔ ہر مسلمان
ئے کلمۃ الحق کے لیے خدا کی فوج کا ایک سپاہی ہے اور اگر عہد حاضر کے مسلمان سپاہیت کی طرف سے
ن برت رہے ہیں تو یقیناً وہ اپنے رسول ﷺ کی پیروی سے غفلت برت رہے ہیں ـــــــ آقائے دوجہاں
اللہ علیہ وسلم) کا متروکہ نہ درہم تھے نہ دینار، نہ لونڈیاں تھیں نہ غلام، نہ املاک تھے نہ تجارت،
ات المومنین کے تنگ حجرے اگر آپؐ کے کسی اثاثہ اور متروکہ سے بھرے ہوتے تھے تو وہ آپؐ کی کمانیں تھیں۔
ـــــــ میں مسلمانوں کو اسوۂ حسنہ کے اس پہلو کی طرف بطور خاص متوجہ کرتا ہوں، میں ان کے ہر ایک
و خالدؓ اور ابو عبیدہؓ کا غلام دیکھنا چاہتا ہوں۔"
مغلیہ کے آخری فرمانروا سراج الدین ظفر تھے۔ وہ عسکریت سے بیگانہ اور بزم شاعری کے صدر نشین تھے
و ملت ان کو زوال سلطنت مغلیہ کی علامت قرار دیتے تھے اور ان کی یاد منانے کو مبارک فال نہیں سمجھتے تھے۔
مرزا، سکریٹری بزم ادب تیموریہ کی طرف سے یوم ظفر کا دعوت نامہ موصول ہوا تو اس کا جواب دیتے ہوئے کہا۔
کا دعوت نامہ پہونچا۔ فرزندان تیمور اور بابر کی بیداری میرے نزدیک طلوع صبح ایشیا کے برابر
اس حرکت پر مبارک باد عرض کرتا ہوں اور شاہان مغلیہ کے عقیدت مند کی حیثیت میں یہ عرض
معافی چاہتا ہوں کہ فرزندان تیمور نے جس دن شمشیر و سناں کو چھوڑا اور چنگ ارباب سے
، وہی دن ان کی تباہی اور بربادی کا دن تھا۔ آج آپ ظفر کی یاد منا رہے ہیں۔ ان کی ذاتی
ں کسی کو کلام نہیں لیکن شاہان مغلیہ کے آخری اور شمشیر بردار نہیں بلکہ شعر گو بادشاہ کی حیثیت سے
ی یاد منانے کو فرزندان تیمور کا اپنی شکست، اپنی ذلت، اپنی بربادی کی یاد منانا سمجھتا ہوں۔
بزم ادب کی شرکت سے معاف فرمایئے جس سے اندیشہ ہے کہ کہیں بابر و تیمور کی عظمت کو میرے
نہ مٹا دے اس دن کی تیاری کیجیے جس دن آپ تیمور صاحبقران، بابر فاتح ہندوستان،
ہ اکبر اور شہنشاہ عالمگیر کی صحیح معنوں میں یاد منانے کے قابل ہو جائیں۔ آنکھوں سے چلتا ہوا
اور اپنے عقیدت کے بوسوں سے آپ کے دست و پا کو رنگین کر دوں گا۔"

اللہ تعالیٰ نے مرحوم قائد ملت کو قلب مومن عطا کیا تھا۔ اس کے ساتھ عشق رسولؐ نے مل کر ان کو ...سان بنا دیا جس کی تلاش مولانا جلال الدین رومی کو رہی اور وہ نہ پا سکے۔ انھوں نے اپنی ...ی کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت | شیر خدا و رستمِ دستانم آرزوست
دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر | کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

ان کی حرارتِ ایمانی تھی جس نے اپنی تعریف میں ادیب الملک مولانا ناظر حسین کا لکھا ہوا قصیدہ پاکر اظہارِ خوشنودی کے بجائے اُن سے اِن الفاظ میں اظہار بیزاری کیا۔

"...... اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ساری تعریف کا مستحق صرف خدا ہے۔ الحمدللہ۔ اگر مجھ میں کوئی چیز قابلِ تعریف ہے تو اُس کا مستحق بھی میں نہیں بلکہ میرا بنانے والا ہے۔ نہایت کافی ہوتا اگر آپ نے بحضور قلب اپنے خدا کا شکر ادا کیا ہوتا کہ اس نے مجھے مسلمانوں اور اسلام کی خدمت کے قابل بنایا۔ دوسری شکایت آپ سے یہ ہے کہ آپ نے میری تعریف کرکے اور خصوصاً مجھے اس سے مطلع کرکے میرے اندر جذباتِ تفاخر پیدا کرنے کی کوشش کی جو تھوڑی سی غفلت میں جذباتِ خدمت کو فنا کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس تحفے کے شکریہ کے طور پر آپ سے متمنی ہوں کہ آئندہ سوائے خدا کے کسی کی تعریف نہ کیا کیجیے اور شعراء اور ادیبوں کے اس راستے کو چھوڑ دیجئے جو ترکستان لے جاتا ہے اور کعبہ سے بیگانہ بناتا ہے۔"

کیا یہ الفاظ مردِ مومن کے علاوہ کسی اور کے قلم سے نکل سکتے ہیں۔ قائد ملت کی مذکورہ بالا خوبیوں کو ذہن میں ...علامہ اقبال کے حسب ذیل اشعار پڑھیے اور فیصلہ کیجیے کہ کیا اُن کی ذات اِن کی مصداق نہیں ہے؟

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن | گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت | یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

یم بخش خالد

اسلامیانِ ہند کا خادم

گرے کے مرثیے (GRAYS ELEGY) کے یہ الفاظ قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کی شخصیت کی بھرپور عکاسی
تے ہیں کہ گلستاں میں ہر صبح و شام نئے رنگین اور معطر پھول کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ ہزاروں کلیاں چٹکتی ہیں اور چند دن
رجانفزا دکھلا کر خس و خاشاک ہو جاتی ہیں۔ نہ باغبانوں کو ان کے کھلنے کا علم ہوتا ہے نہ گلچیں کو اس کی پرواہ۔ اس طرح سمندر
ہنوں میں ایسے تابناک موتی پوشیدہ ہوتے ہیں جو اگر ساحل سمندر پر آئیں تو ان کی ضیا پاشیوں سے اندھیرے پاش پاش
جائیں اور چار سو روشنی جگمگا اٹھے۔

جنوبی ہندوستان سے ایک ایسا ہی حیات افزا اور روح پرور پھول کھل اٹھا جس کی خوشبو سے نہ صرف ہندوستان
گوشہ گوشہ مہک اٹھا بلکہ عالم اسلام میں بھی اس کی رعنائی اور دلسوزی کا سکہ بیٹھ گیا۔ نواب بہادر یار جنگ نے اپنی مختصر حیات میں
سلام اور اسلامیانِ ہند کی ایسی دینی، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی خدمات انجام دیں جو کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔
اہر ہے کہ ان کی قدآور قومی شخصیت کے حوالہ سے میرا موضوع تحریر چھوٹا سا معلوم ہو رہا ہے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ میں قائدِ ملت
ی بلند و بالا شخصیت کو جغرافیائی حدود کے تناظر میں پیش کرکے اپنی عصبیت کو آشکار کر رہا ہوں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ
زو کی حیثیت تسلیم کئے بغیر 'کل' کا تصور مکمل اور واضح نہیں ہو سکتا۔ مسلم ہند کی تاریخ زاویوں سے سندھ کو ایک اہم
قام حاصل رہا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس خطے کی پوری تاریخ کو ہنوز مدوّن نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ناقابل معافی غفلت ایک قومی
انحہ ہے جس کا ازالہ کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ اور اس فرض کی ادائیگی کے ضمن میں میں چند چیزیں رقم کر رہا ہوں حالانکہ مجھے احساس
ہے کہ اس موضوع سے میں انصاف نہیں کر سکتا ہوں۔

سندھ کے جنوبی ہند سے قدیم زمانہ سے تجارتی روابط تھے۔ سندھ کے عظیم صوفی دانشور شاہ لطیف بھٹائی کی ابیات میں
تفصیل سے یہ مذکور آتا ہے کہ سندھ کے ملاح بحری بیڑوں میں سامانِ تجارت لے کر موجودہ انڈونیشیا، جاوا، سوماترا، اور ملائیشیا
جاتے تھے۔ اور راستے میں جنوبی ہند کے ساحل اور سری لنکا سے ان کا گذر ہوتا تھا۔ یہ بیان سرود سامونڈی اور سر براگ
میں آتا ہے۔ لیکن سرود سارنگ میں 'دکن' کا نام واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس سرود میں بارش کا ذکر ہے کہ رب رحیم کس طرح
مختلف علاقوں کو بارانِ رحمت سے نوازا کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کے شارحین نے ان ابیات میں مذکور فضل ربی، کرم کریم اور
عنایتِ الٰہی کو رسول کریم کی ولادت کی علامت قرار دے کر آپ کی رشد و ہدایت کی تشہیر اور توسیع کا مطلب نکالا ہے۔